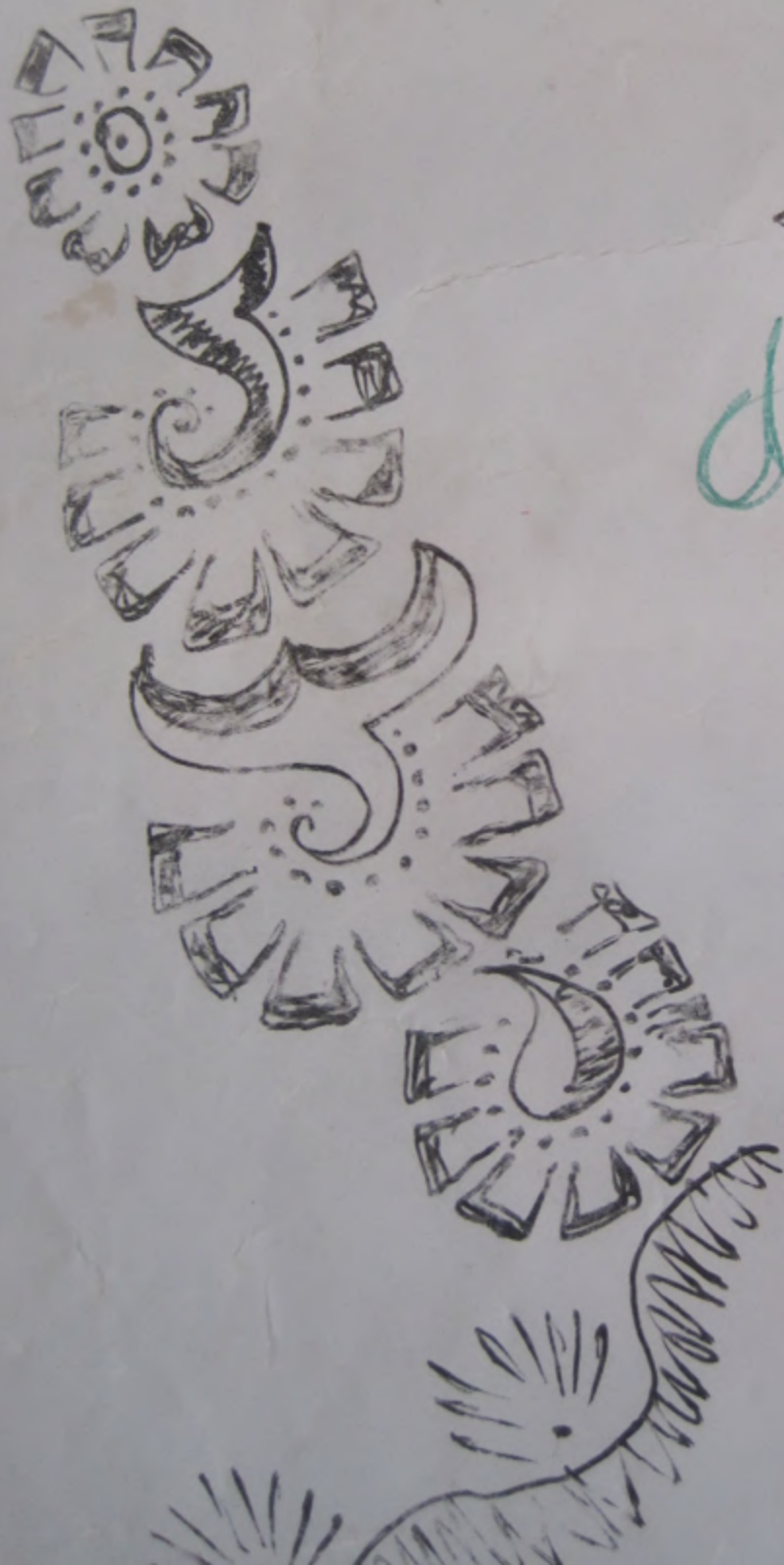


Jan 04



انجہ

# کتابیں

کمل ناول

سیدہ گل بانو 40

چاند تیری نید عید میرے پیار کی

ناول

فرزانہ مغل 94

دکھ بنے گلاب

ریحانہ آفتاب 164

من کی گلیوں میں پنہاں محبتیں

ناولٹ

سونیا احمد 20

شرط بنی ضد

سعدیہ امل کاشف 152

شیشے سے بنی ایک لڑکی

افسانے

نسرین رانا 90

حسن اتصال

ثناء خان 38

دل کے بہت پاس ہو تم

ابتدائیہ

مدیرہ 22

سرگوشیاں

تنویر پھول 23

حمد نعت

مدیرہ 24

در جواب آل

دانش کده

28

حکیم محمد سعید شہید

تعلیم

ہمارا آنچل

30

ادارہ

عاطفہ حبیب صبا نواز

غزالہ چھیری

34

شبیر احمد دلبر

مصور علی

جیون ساتھی

37

ادارہ

صنوبر ہمراہ شیخ سجاد اکرام

سلسلہ وار ناول

72

اقراء صغیر احمد

تیری الفت میں صنم

136

عشنا کوثر شرمار

افسوس جاں

204

عفت سحر پاشا

سبز رتوں کی جھیل میں



# چاند نیری دیکا عید میرپوری

سیدہ گل بانو

پہاڑی لڑکی  
اب چھوٹا  
بہنوئی  
اگر

میری	پلکوں	کے	اس	پار
اک	چاند	کے	طلوع	میں
قبولیت	کی	گھڑی	پالینے	تک
آؤ	دعا	کے	سفر	میں
ساتھ	تمہارا		مانگ	لیں

”سنو“ وہ دادا جان کے کمرے سے شام کا اخبار اٹھا دیکھا پھر باتیں۔

کر سامع چچا کو دینے جا رہی تھی جب عقب سے بہت بے تاب لہجے میں پکارے جانے پر اس کے تیز تیز سیڑھیاں اترتے پاؤں یکدم کھم گئے۔ اگلے ہی پل وہ بے اختیار دو سیڑھیاں مزید اتر کے اس کی سمت گھوم گئی وہ اس کے عین سامنے بالکل قریب کھڑا تھا۔

”جی؟“ وہ خاصی عجلت میں تھی۔ روزہ افطار ہونے

میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ ابھی لڑکیاں کچن میں کھسی افراتفری کا شکار تھیں۔ وہ سامع چچا کو اخبار دے کر ادھر

ہی جا رہی تھی کہ عارض کے پکارنے پر اسے ٹھہر جانا پڑا۔

اس کے یوں پکارنے پر وہ اندر ہی اندر جھنجلائی مگر مہمان

ہونے کا خیال کر کے اسے ادھر متوجہ ہونا پڑا۔ نہ صرف یہ

بلکہ مدہم سی مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر سجانی پڑی کیونکہ اپنی

آنکھوں میں لہرائی جھنجلاہٹ کا تاثر زائل کرنے کے

لئے اسے یہ مسکراہٹ بڑی ضروری اور بروقت آزمحسوس

ہوئی تھی۔ اس کے پوری طرح اپنی طرف متوجہ ہونے پر

اس نے لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے پہلے دائیں

معلوم نہیں ان لفظوں کا بوجھ وہ کب سے دل بے

تاب کی مضطرب و بے قراری دھڑکنوں میں چھپانے

دبائے جیسے آج ہار گیا ہو جیسے اس کا تمام ضبط جواب

دے گیا ہو۔ اس کی وہ خمار آلود بھنورا سی آنکھیں بھی یہی

کہانی سنار ہی تھیں۔ بے حد مضبوط اپنی ذات میں مست

ولکن قدرے موڈی اور لیے دیئے رہنے والے ریزر

سے بندے کا یہ روپ اک پل میں اس کے حواس اڑا گیا

تھا اور وہ اڑے بکھرے حواس منتشر اعصاب اور لاپرواہ



چنچلی دھڑکنوں میں بہت اچانک ہو جانے والی انوکھی اچھوتے نوخیز جذبات کی یلغار پر ساکت و جامد کسی پتھر کی مورتی کی مانند ساکت سی کھڑی اس کی جانب بکتی رہ گئی تھی۔

ان دو کھلی کھلی کشادہ بھنورا آنکھوں میں یکنخت جل اٹھنے والے دیپ اس کی ریشمی پلکوں پہ پل بھر میں کسی حسین خواب کی سی محویت سجائے تھے اس محویت کے دلنشین نازک سایوں تلے اس کی حیرت سے واساکت رہ جانے والی آنکھوں کے دو نوخیز کنوارے کنول ان دو بے باک نگاہوں میں مچلتے بے تاب و تڑپ کا دلکش رقص پیش کرتے، شوخی و شرارت کے خسین جگنوؤں کی اس قدر جسارت پہ دنگ تھے۔

”انوشہ“ نگین کی کچن سے آنے والی زوردار آواز پہ وہ جیسے کسی طلسمی سحر سے جھٹکے سے آزاد ہوئی تھی۔ سٹپا جانے والی آنکھوں پہ سیاہ پلکوں کی دراز جھالریں حیا اور اس کی نگاہوں کی حدت سے جل اٹھنے والے رخساروں پر گرانی وہ یکنخت تیزی سے پلٹی۔

”انوشہ“ اگلے ہی پل اس کا رخ پڑ جانے والا گداز ہاتھ ایک مضبوط ہاتھ کی پرحدت سپاٹ لمس والی کشادہ ہتھیلی میں بچنے کے رہ گیا۔ انوشہ کو جیسے کوئی برقی رواپنے ہاتھ کو چھوئی پورے وجود میں سرایت ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ لحظہ بھر کو دھک سے رہ جانے والے من کے ساتھ پل بھر کے لیے ساکت ہوئی مگر دوسرے ہی پل وہ سرعت سے اپنا ہاتھ اس کی مضبوط ہوئی گرفت سے نکالتی تیزی سے قدم بڑھاتی اس سے لمحوں میں دور ہوئی چلی گئی تھی۔

عارض نے نہایت مایوسی کے عالم میں جھنجھلائی سی نظروں سے پہلے اپنے عقب میں پھر دائیں بائیں تکتے ہوئے اک طویل گہرا سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کیا اور پھر دور دوری ہوئی انوشہ کے سر پر ٹکے سرمئی آنچل کے نیچے سے جھانکتی کمر تک جھوٹی سیاہ ناگن سی چٹیا کو تکتا بے ساختہ ابرو اچکاتے ہوئے لب سکڑ کے

بالوں پہ ہاتھ پھیرتا پلٹ گیا۔  
”تو پاگل ہو گیا ہے عارض؟“ ذیشان اس کی اس تیز ترین کارستانی کی تفصیل سننے کے دوران جیسے کرتک سے اچھلتا تھا۔

”تو نے انوشہ سے کہا یہ سب؟“ مارے حیرت و یقینی اور پریشانی کے وہ بس جیسے بے ہوش ہونے کے قریب قریب تھا۔  
”مجبوری تھی بھائی۔“ عارض کندھے اچکا کے معنی خیزی سے مسکرایا۔

”اب تو اپنی خیر منا اور پہلی فرصت میں ادھر سے اپنے بوریا بستر گول کر۔“

”ارے چھوڑ یار۔ میں کوئی تمہاری طرح بزدل تھوڑی ہوں جو ذرا سی بات پر تھر تھر کانپنے لگوں۔“  
”فضل سے مرد بچہ ہوں۔“ عارض نے اس کی بدحواسی کا مذاق اڑایا۔

”اے مرد کے بچے بات مان میری اور نکل لے پتلی گلی سے صبح کا سورج بعد میں نکلے گا پہلے تیری عزت کا جنازہ نکلے گا ادھر سے۔ تیری اس مردانگی کی تو ایسی کی تیری کردے گی وہ پٹاخہ انوشہ۔“ ذیشان نے نتائج کی متوقع سنگینی کا احساس دلانا چاہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میری جان۔“ عارض نے انگشت شہادت کی پشت سے اپنی ٹھوڑی کو دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے معنی خیزی سے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر یقین بھری مسکراہٹ تھی۔

”میں نے تجھے اول روز ہی بتا دیا تھا کہ تو چاہے پورے خاندان کی لڑکیوں سے اپنا ٹاٹا جوڑ لینا لیکن اس شعلہ جوالا کو مت چھیڑنا، پر تو وہی کرتا ہے جس سے تجھے باز رکھا جائے۔“ ذیشان کو سخت غصہ آ رہا تھا اس کی اس جلد بازی میں کی گئی خطرناک حماقت پر۔

”یار کیا کرتا میں پھر بڑا مجبور تھا میں میرے مہلت بہت کم ہے۔ پہلے ہی پانچ روز سوچ سوچ کے دیئے۔ تو جانتا ہے عید سے پہلے پہلے میری ادھر سے



حیرانی ظاہر کی تھی جس پہ عارض کی مونی مونی غلامی  
آنکھوں میں بڑی معنی خیزی چمک لہرا گئی اور لبوں کے  
گداز میں اک بڑی محظوظ کن سی بھرپور مسکراہٹ بکھرتی  
چلی گئی۔

”اس میں اتنی حیرانی والی کیا بات ہے یا تو تو جانتا ہے کہ میں آنکھوں سے جادو کرتا ہوں۔“ وہ اپنی مسکرائی جادو بھری آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں ڈال کر مسکرایا۔

”اونہ سوائے ان آنکھوں اور اس کھمبے جیسے لمبے قد کے اور بے بھی کیا تیرے پاس۔“ اس کا ہنوز بے فکر انداز گہری ہوئی مسکراہٹ ذیشان کو جلا گئی۔ اس کا تو اطمینان ہوا ہو گیا تھا اور عارض کے کسی بھی انداز سے فکر مندی یا پچھتاوانہ جھلک رہا تھا۔ گندمی چہرے پر اطمینان کا راج تھا۔

”ایزی یا رتم کیوں اس قدر پریشان ہو رہے ہو۔“  
 ”تو نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ نہ صرف مجھے بلکہ خود  
 تجھے بھی اپنے اس کارنامے پہ پریشان ہونا چاہیے۔ پر  
 خدا جانے تو کس ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا ہے۔“ وہ غرایا۔  
 ”چل چھوڑ اتنا سوچ سوچ کر پریشانی سے کہیں  
 فوت ہی نہ ہو جانا۔“ عارض نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دیا  
 کر اس کی پیٹھ کو تسلی آمیز انداز میں تھپکا۔ وہ اسے گھورنے  
 لگا۔

”کیسے چھوڑ دوں“ میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا تو اتنا  
احمقانہ قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔“

”وہ تو میں نے تمہیں یہاں آتے ہی پہلے روز مطلع کر دیا تھا اپنے ایسے احمقانہ اقدام کے بارے میں۔“

”پہلے روز تو میں مذاق سمجھا تھا اور دوسرے روز تک تو میں تیری ساری بات بھول بھی چکا تھا‘ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تو واقعی انوشہ پہ ڈورے ڈالنے کے چکروں میں مصروف ہو گیا ہے۔“

”سٹاپ شانی“ میں نے کوئی ڈورے وورے نہیں  
ڈالے کسی پتہ جتنا کیا پوری سچائی سے بتا دیا ہے تمہیں۔“  
عارض اس کی بات کا برا مان گیا۔ اپنی کردار کشی تو کسی بھی

واپسی ممکن ہے۔ "اس کی خفگی کے خیال سے وہ قدرے  
سنبھل کر سنجیدگی سے بولا۔

جہل رنجیدی سے بولا۔  
 ”او میرے بھائی میں نے تیری مدد سے انکار تو نہ کیا  
 تھا۔ مگر تو جانتا ہے اپنے خاندان کی لڑکیاں ذرا سخت  
 مزاج ٹاپ کی ہیں اور وہ انوشہ تو سب سے زیادہ سخت  
 مزاج کی ہے بلکہ سب سے یکدم جدا بالکل ہٹ کر ہے  
 وہ سب سے یار۔“

وہ سب سے یار۔  
 ”تو یار اب کیا ہو سکتا ہے، اب تو تیرا کمان سے نکل چکا۔“ عارض گال کھجکا کے قدرے کھسیانی مسکراہٹ اور لہجے میں معصومیت سمو کر بولا جو اباذیشان نے چٹکی بجا کر الارٹ کیا۔  
 ”بس تو اب ادھر سے کوچ فرمانے کی فکر کر، تیرا دانہ بانی ادھر سے اٹھ چکا ہے۔“

”اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں  
کھیت۔“ عارض لا پرواہی سے سر کو جھٹکتا بایاں ہاتھ اٹھا  
کے سر صوفے کی بنک پر دھرتے ہوئے انگلیوں کی  
پوروں سے پیشانی پر بھرے بالوں کو سمیٹنے لگا اس کی یہ  
بے نیازی و دیشان کو مزید بھڑکا گئی۔

”ایک بھی بال نہیں بچے کا تیرے اس اگلو تے سر پر،  
جب وہ اپنی چھ ساڑھے چھ انچ کی ہیل کے ساتھ تیری  
کھوپڑی میں اپنے غیظ و غضب کی کیل ٹھونکنے لگی۔“  
”پرواہ نہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ اسے مطلق پرواہ  
نہ تھی۔

”مروائے گا‘ تو مروائے گا اپنے ساتھ مجھے بھی۔“

ذیشان اب فکر مند سا پریشانی سے ہاتھ مل رہا تھا۔  
 ”لو تمہاری موت کس حساب میں ہے اس سارے  
 چکر میں؟“ عارض کو اس کے چہرے پر اڑنی ہوئیاں دیکھ  
 کر ہنسی آ گئی۔

”بکواس مت کر۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہیں میں تو حیران ہوں تیری اس قدر جرات یہ آخر انوشہ نے تیری وہ بکواس سنی کیسے اور تو اس کے ہاتھوں سے بچ کیسے گیا؟“ اس نے کوئی دسویں بار ایک یہی



”یہ بھی ابھی کم ہے کیا؟“

”یار شانی تجھے پتا تو ہے میں کتنا مجبور۔“

یہ ناپسندیدہ فعل اس قدر ناقابل یقین و پریشان کن تھا مزید اس کی مجبور مجبور کی رٹ نے ذیشان کو جلتے تو سے پہ جا بھایا۔

”اچھا سوری بس اب میں مزید کچھ نہیں کروں گا۔“  
عارض نے فوراً ہاتھ جوڑے ذیشان ایک گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”دیکھ یار عارض مجھے تیری مجبوری کا بھی اندازہ تھا میں نے تیری مدد کا وعدہ بھی کیا تھا، نگین کی ہیلپ لینے کا بھی میرا ارادہ تھا، وہ ضرور ہمارا ساتھ دیتی مگر تجھ سے چند دن صبر نہ ہوا اور یہ نیا کھڑاگ میرے سر پر ٹینشن بنا کر مسلط کر ڈالا ہے۔ ہر کام کا کوئی طریقہ ایک مناسب وقت ہوتا ہے یا نہیں تجھے اگر آنٹی کو دو ٹوک انکار ہی کرنا ہے تو وہ تو کسی دوسرے طریقے سے بھی تو اپنا انکار ان تک پہنچا سکتا تھا۔ کیا یہ ضروری تھا سب۔“

”اچھا کہہ دیا ناں اب مزید کچھ ایسا نہیں کروں گا۔“  
”کچھ مزید کی گنجائش ہی کہاں رہنے دی ہے۔ جو ہوا وہ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انوشہ کو حقیقت بتا کر کسی نہ کسی طرح کنوئیں کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہوگا کیونکہ وہ بڑی مضبوط سمجھدار اور لا پرواہ سی فطرت کی مالک بڑی سے بڑی پریشانی اور پرالہم کو چٹکیوں میں اڑا دینے والی لڑکی ہے مگر یار عارض ہے تو ایک لڑکی ناں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سپنوں کی وادیوں کی سحر انگیز رنگینیوں سے نا چاہتے ہوئے بھی متاثر ہو جانے والی جذبوں کی حدتوں سے موم ہو کر پکھل جانے والی دھڑکنوں اور چاہتوں خواہشوں سے گندھے نازک احساسات بھرا گداز نازک سادل رکھنے والی ایک نازک کانچ جیسی لڑکی۔“

”محض چند لفظوں کی ایک باشعور عاقل و بالغ انسان کی زندگی میں اتنی بھی کیا اہمیت کہ وہ ان کے وقتی سحر میں

دوب کر حقیقتوں کی سچائی کو ہی فراموش کر دے اس کے لفظوں کی گہرائی میں چند لمحوں کو الجھ جائے پھر سے اپنی مخصوص بے نیازی سے سر جھٹک کر اپنے بیٹے یہ تیرا یورپ کی سر و مہر فضاؤں سے مغرب نہیں جہاں جذبات کی حدتوں کو وقتی محرکات کر شفاف گداز احساسات کی سچائیوں کو جھٹکا دیا جائے یہ مشرق ہے میری جان مشرق یہاں بقول تمہارے چند لفظوں کا یہ وقتی سحر کسی کی زندگی کو مضبوطی سے محصور و بے بس کر دیتے والی زنجیر بھی بن جایا کرتے ہیں۔“  
”اوشٹ کیا فضولیات ہے یہ سب اپنی حیات اپنی ساری زندگی کے فیصلے کا اہم ترین معاملہ چند لمحوں کی جذباتیت کو سوئپ دینا نہ صرف ایک بچہ ہے بلکہ سراسر مضحکہ خیز اور احمقانہ اقدام بھی۔“  
”تو باہر ہے یہ سب عجیب و غریب جگہ فضا باتیں۔“ عارض جیسے بے اختیار کسی لطیفے پہ ہنستا رہ گیا تھا۔

”سمجھ جائے گا بچے جلد سمجھ جائے گا جب بندے کو ٹھوکر نہ لگے نا تو اس سے پہلے ہی اس کو اذیت کو بھلا کون محسوس کر سکتا ہے مگر خیر یہ سب چھوڑ اور اب تو انوشہ کے ساتھ تیرے ممکنہ نفس کے خود کو ابھی سے تیار رکھ کیونکہ اس کے بنا تو تو عزت و شرافت سے ادھر سے ٹلنے والا نہیں لگتا۔“

”تم خود ہی اسے سب کچھ صاف صاف بتا کر نہ یہ کام اپنے سے تو نہیں ہونے والا اب خود بچو جی یہ خوب رہی کرے کوئی بھرے کوئی۔“  
نولفٹ کی ناگوار سلوٹیں ماتھے پر سجا کے پھر وہاں آئے بھی نہ رکا تھا۔ جب کہ وہ پہلی بار قدرے پریشان سا اسے پکارتا ہی رہ گیا مگر لہجے میں تمام تر بے چارہ مٹھاس سمونے کے باوجود اسے شدید ناکامی کا سامنا پڑا۔



ستارہ اس کی سگی ماں تو نہ تھیں مگر انہوں نے اسے



آسانی سے کنٹرول میں لے لیا۔ اپنا سوچا اور ماحول سے بالکل مختلف اور نئے ماحول میں اپنی زندگی کے گیارہ سال گزارنے کے بعد ایک قابل و کامیاب انسان کے روپ میں وہ پاکستان آیا تھا، مگر ہمیشہ یہیں رہنے کے ارادے سے نہیں بلکہ ایک روز پھر وہیں لوٹ جانے کے لیے اس کے آنے کی خوشی میں ستارہ نے گھر میں بہت خوب صورت سی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ دور نزدیک کے سبھی رشتے داروں نے شرکت کی تھی اسے کچھ چہرے یاد تھے کسی کو وہ بھول گیا تھا سب کانٹے سرے سے اس سے تعارف کرایا گیا ہر طرف قہقہے تھے ہر طرف رنگ و خوشبو کا سیلاب، روشنیوں، مسکراہٹوں کے جلتنگ کی جگمگاتی کھنک، مگر عارض کا دل پھر بھی کسی خالی سونے گھر کی طرح ویران اور اداس تھا۔ ہزاروں چہرے تھے مگر ان میں اس کے پیارے بابا جان کا مہربان چہرہ نہ تھا۔ نہ اس کی جنت اس کے جیون کی انمول خوشی اس کی ماں (نگہت بیگم) کا خوب صورت شفیق چہرہ تھا۔ سب کچھ بہت خوب صورت تھا، بے حد حسین و دل فریب رنگوں میں دھلا دل کو موہ لینے والا ہر منظر تھا مگر پھر بھی وہ اداس تھا۔ اس گھر میں قدم رکھتے ہی ان فضاؤں میں سانس لیتے ہی جیسے اسے ہر احساس ہر شے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اور ایسے میں اس کے بچپن کے دوست اور کزن ذیشان کی ذات ہی تھی جس نے اس کی بے نام سی وحشتوں کے سلگتے دھکتے الاؤ پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار کا کام کیا تھا۔ خاندان بھر کی حسین، دلشین، چمکتی، ہنسی، کھلکھلائی لڑکیوں اور ان کی سہیلیوں کے جھگڑے کے بیچ شوخ و شریر سے مسکراتے قہقہے لٹاتے، اس کے دیگر کزنز اسکول کے زمانے کے دوستوں نے خوب محفل گرم کر رکھی تھی اور ان سب میں ایک طرف اپنی سادگی بھری فطرت اور دوسری طرف حاضر جوابی کے باعث ذیشان سب سے نمایاں تھا اور عارض کے دل کے سب سے زیادہ قریب۔

پارٹی کے اختتام کے بعد عارض نے اصرار سے ذیشان کو کچھ دن مزید اپنے پاس روک لیا۔ ذیشان نے

ماں جیسا ہی پیار دیا تھا۔ انہوں نے پوری کوشش کی تھی کہ اورنگزیب (عارض کے والد) کی وفات کے بعد کسی بھی قسم کا احساس محرومی عارض کی ذات کا حصہ نہ بنے۔ وہ کلاس تاسکھ کا اسٹوڈنٹ تھا جب اورنگزیب کا انتقال ہوا۔ ستارہ سے اورنگزیب کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ ستارہ کو یوں تو عارض کی وجہ سے کبھی کوئی خاص پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا مگر اورنگزیب کی وفات کے بعد عارض شدید ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کے رہ گیا جس کی وجہ سے اس کی شخصیت بھی بری طرح متاثر ہونے لگی، گھر سے پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ سا ہونے لگا۔ حتیٰ کہ اپنے دوستوں اور من پسند ایٹنی ویٹیز تک سے وہ بری طرح اکتانے لگا، ارد گرد کے ماحول سے تو کیا وہ تو جیسے فضاؤں، ہواؤں تک سے چڑنے لگا تھا۔ شادی کی پہلی رات ہی اورنگزیب سے کیا گیا وعدہ ستارہ کو یاد تھا۔ عارض کی بہتر تعلیم و تربیت اور کامیاب مستقبل کی ان کے امید بھرے دل کو اتنی ہی فکر تھی جتنی کہ اورنگزیب کو مگر پندرہ سالہ عارض کے مزاج میں ستر اسی سالہ انسان جیسی اکتاہٹ اور بے دلی کو دیکھ کر ستارہ کا پریشان ہو جانا لازمی سی بات تھی۔ انہوں نے عارض کو تو کبھی سوتیلی اولاد سمجھا ہی نہ تھا۔ عارض کے لیے ان کے پاس اپنی اولاد کی طرح ہی محبت و شفقت کے بیش بہا خزانے تھے۔ اپنے محبوب شوہر کی چیتنی اولاد ہونے کے باعث عارض ان کی آنکھوں کا بھی تارا بن گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے محبت اور بے حد نرمی سے پیش آتی تھیں مگر ان کو اپنی محبت کو اپنی نرمی کو کرختی میں بدلنا پڑا۔ عارض کے بدلتے روکھے پھیکے تیور اور پڑھائی کے معاملے میں بے دلی نے ستارہ کو ایک قدرے مشکل مگر حتمی فیصلے پر اکسایا۔ انہوں نے اسے اپنے بہنوئی اور بہن کے پاس لندن بھیج دیا۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ دو عارض سے بڑے اور ایک اس کا ہم عمر ستارہ کی بہن صبیحہ اور بہنوئی خاور بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں ستارہ سے بھی زیادہ کڑے تھے۔ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ انہوں نے عارض کو بھی بڑی



ہنسی خوشی اس کی یہ فرمائش پوری کی تھی۔ عارض جو چھ روز سے گھر اور بیڈروم تک ہی خود کو قید کیے ہوئے تھا ستارہ کے حکم پر ذیشان اسے ساتھ لے کر مری کی حسین فرسوں فضاؤں کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ ان جنت نظیر فضاؤں کے فرسوں میں ہفتہ بھر خود کو گم کیے رہنے کے بعد واپسی پر عارض نے خود کو بے حد فریش، تازہ دم محسوس کیا۔ وہ ذیشان کا تہہ دل سے ممنون تھا کہ اس نے اپنی جاب اور دیگر ذمے داریوں کو نظر انداز کر کے بڑے مخلص اور خوب صورت انداز میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

ذیشان نے ہفتے بھر کی آوارہ گردی کے بعد گھر جانے کا اعلان کیا تو وہ اسے مزید نہ روک سکا البتہ خود اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔

ستارہ اسے زندگی کی ہنسی مسکراتی ڈگر پہ قدم رکھتے دیکھ کر خاصی مطمئن تھیں۔ انہوں نے خوشی خوشی اسے ذیشان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔ عارض اور ذیشان ستارہ سے نظر بچا کر ایک دوسرے کی طرف تکتے آنکھ دبا کر مسکرا دیئے تھے اگر ستارہ کو اس کا ذیشان کے ساتھ جانے کا مقصد معلوم ہو جاتا تو وہ اسے بھی جانے کی اجازت نہ دیتیں۔

معاملہ فقط اتنا تھا کہ وہ جس ماحول کا عادی ہو گیا تھا اور جہاں خود کو قدرے پرسکون محسوس کرتا تھا اب اپنی حیات کا اگلا ہر لمحہ وہیں بسر کرنا چاہتا تھا۔ اپنے جیون کی ہر ساعت اور ہر سال جب کہ ستارہ اب اس کو واپس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہنے بسنے کے لیے آمادہ کرنا چاہتی تھیں مگر اپنی برداشت سے زیادہ یہاں ایک پل بھی رہنا عارض کے بس کی بات نہ تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے اگرچہ اپنی اس متضاد خواہش کا کھلا اظہار تو نہ کیا تھا مگر ستارہ کی اب اس کا گھر بسانے کی زور پکڑتی ضد نے عارض کو چونکا کر دیا ستارہ کی بے پایاں محبت ایک طرف مگر ان کی حاکمانہ فطرت اور بارعب انداز سے وہ شروع ہی سے کتراتا اور دبتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اسے ایک ہی حل سوچا تھا کہ جس کے سہارے وہ

ستارہ کو باقاعدہ انکار تو نہ کر سکتا تھا مگر اپنی انجینئرنگ تعلیم مکمل ہونے تک کے اس اگلے ایک برس تک مال دے سکتا تھا۔ وہ تو ابھی بھی نہیں آنا چاہتا تھا مگر ستارہ کی بیمار کی خبر یا کر خاورِ اقل نے اسے پہلی فرصت میں پاکستان پہنچنے کا حکم دیا۔ کچھ ایسا ہی حکم ستارہ کی طرف سے بھی تھا تو پھر بھلا وہ انکار کیسے کر سکتا تھا۔ ستارہ یہ فانی کا ایک تھا جو کہ بے حد معمولی تھا۔ اس لیے وہ جلد ہی صحت یاب ہو گئی تھیں مگر عارض کو اپنی خیریت خطرے میں پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہاں رہنا ہی نہ چاہتا تھا تو پھر وہ گھر بسا لینے کی ہمت کہاں سے لاتا۔ اس نے وہ حل ذیشان کے آگے بیان کیا تو اس نے تھوڑا بہت تو ضرور سہا مگر اس حل میں اپنے خاندان کی کسی بھی لڑکی کو حل کر لینے سے سختی سے باز رہنے کی تاکید کی۔ عارض کو اپنے سوچے گئے اس حل کے مطابق کسی لڑکی سے افیئر چلا کر تھا جو کہ اسکی نڈل بن کر بلکہ بنا کر ستارہ کے علم میں لایا جاتا تو وہ اسے جواب طلبی کے لیے اپنے سامنے ضرور لا کر کرتیں اور ایسے میں اسے ان کو پورا پورا یقین دلانا تھا کہ وہ واقعی اس لڑکی کی محبت بلکہ عشق میں ڈوب کر ہوش و حواس کھو دینے کے ابتدائی مرحلے میں قدم رکھ چکا ہے مگر اس کا فیوچر اس کا کیریئر اس کے لیے بہر حال ہر بات سے اہم ہے لہذا وہ اپنی تعلیم مکمل ہونے سے قبل تو اپنی ازدواجی زندگی کا پل باندھ لینے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔ ہاں مگر ایک سال بعد وہ اس لڑکی کو اپنا نام دے کر اسے اپنانے ضرور آئے گا اور یہ بات تو ستارہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ اپنے عہد کا پکا ہے چاہے کچھ ہو جائے اپنے قول سے پھرنے والا نہیں وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔ یہی سوچ کر وہ اسے مطمئن ہو کر لندن جانے کی اجازت دے دیتیں مگر ذیشان کا خیال تھا کہ شادی نہیں تو کم از کم منگنی جیسا بندھن تو وہ ضرور اسی لڑکی کے ساتھ باندھ دینے کی ضد تو کر ہی سکتی ہیں کیونکہ ہم صورت ان کو عارض کے کنوارے پن پر ڈپازٹ کا لیبل چسپاں کر کے اس کے لوٹ آنے کی آس کو امید میں باندھ



کے اس اگلے ایک برس تک مال  
س آنا چاہتا تھا مگر ستارہ کی بیماری  
اسے پہلی فرصت میں پاکر ستارہ  
محکم ستارہ کی طرف سے بھی  
تا تھا۔ ستارہ یہ فالج کا ایک  
اس لیے وہ جلد ہی صحت یاب  
فی خیریت خطرے میں  
ارہنای نہ چاہتا تھا تو پھر اورو  
سے لاتا۔ اس نے وہ  
اس نے تھوڑا بہت تو ضرور  
اندان کی کسی بھی لڑکی کو  
نے کی تاکید کی۔ عارض کو  
بق کسی لڑکی سے افینر چلا  
کر ستارہ کے علم میں لایا  
اپنے سامنے ضرور لا کر  
پورا پورا یقین دلانا تھا  
شق میں ڈوب کر ہوش  
حلے میں قدم رکھ چکا۔ تب  
اس کے لیے بہر حال تھا وہ  
مکمل ہونے سے قبل ایک لڑکی  
لینے کے متعلق سوچا تو  
دو وہ اس لڑکی کو اپنا  
کا اور یہ بات تو نہ وہ اس  
عہد کا پکا ہے چاہے تازک  
الائیس وہ لوٹ کر رہے بھی  
ممکن ہو کر لندن جا۔ جسم  
کا خیال تھا کہ شاید  
وہ ضرور اسی لڑکی کی  
نی سکتی ہیں کیونکہ  
پلٹ پر ڈپازٹ کا  
آس کو امید میں

مقصود ہو گا کہ ان کے ارادے تو ایسے ہی دکھائی دیتے  
تھے۔ لہذا عارض کے گھر سے نکلنے وقت یہ طے ہوا تھا۔  
ذیشان کے حکم کے مطابق کہ خاندان کی کسی لڑکی کو نشانہ  
نہیں بنایا جائے گا اور وہ کوئی بھی لڑکی ہو اسے پہلے ہی یہ  
ضرور بتا دیا جائے گا کہ عارض کے ساتھ اس کا تعلق محض  
وقتی اور ایک ذرا مہ ہو گا جس کا اس لڑکی کو ایک مقررہ وقت  
تک ساتھ دینا ہو گا اور اگر بات مغنی تک پہنچی تو وہ لندن  
پہنچے ہی اس بندھن کو توڑنے کا اعلان کر دے گا۔

عارض اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور ذیشان اس  
کی اور اپنی دوستی کے مضبوط رشتے کے آگے چونکہ عارض  
کا مقصد ناجائز نہ تھا اسی واسطے وہ اس کی التجا پر اس کی مدد  
یہ آمادہ ہو گیا مگر صنف نازک کے لیے بڑا احساس سادل  
ہر کھنے والے ذیشان کا یہ کہنا تھا کہ وہ جس لڑکی سے بھی  
اسے پوری دیانتداری و شرافت سے پہلے  
کچھ صاف صاف بتا دے تب عارض نے اس  
کی اس شرط پر استہزاء یہ ہنستے ہوئے اسے ہی کسی ایسی  
لڑکی کو تلاش کرنے کے لیے کہا جو خوشی خوشی اپنی مرضی سے خود  
کو اس جھوٹ موٹ کے افینر کے لیے پیش کر سکے اور  
تب ذیشان نے بڑے فخر سے ٹکین کا نام لیا۔ اسے یقین  
تھا وہ ٹکین کو ضرور آمادہ کر لے گا، بھی تو وہ بھی خاندان کی  
اپنی پسند کی پسند اور محبت بھی  
سے اپنی پسند کا اظہار کر چکا تھا، سب کے  
سامنے یہ اظہار کرنا بھی باقی تھا۔ ذیشان کو بڑا مان تھا کہ  
اس کی مشکل اور عارض کی الجھن کا آدھا بوجھ اپنے  
پر بڑے شوق سے اٹھالے گی مگر ذیشان  
بھی جانتا تھا کہ ٹکین اس آمادگی سے پہلے اس کا کسی بھی  
شمر کا حشر دنیا کے سامنے نشر کر سکتی ہے جس کے لیے  
سے تیار کرنا تھا اور پھر ذیشان کی یہ  
اور اس کے ضبط کی لگام اس کے  
وقت چھوٹ گئی جب ستارہ نے فون پر اسے  
قبل گھر آ جانے کی تاکید کی۔

وہ دادا جان کے کمرے میں ان کے پاس بیڈ پر بیٹھا

موبائل پر ستارہ سے بات ختم کرنے کے بعد وہاں سے  
اٹھ کر وضو کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ جی  
کے سرمنی کلر کے سوٹ میں ہم رنگ بڑا سا دوپٹہ سر پہ  
ٹکائے نازک سراپے کے گرد لپیٹے بڑی عجلت بھرے  
انداز میں دادا جان سے اخبار مانگتی کمرے میں داخل ہوئی  
تھی۔ جب وہ اخبار لے کر اسی تیزی سے کمرے سے  
نکلنے کو پہلی اسی سے وہ جیسے کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر اس  
کے پیچھے کھینچا چلا گیا۔ وہ سیڑھیوں پر قدم دھر چکی تھی۔  
جب عارض نے ایک گھرے سانس سمیت اسے پکار لیا۔  
وہ رکی پھر پلٹے بنا وہ چہرہ اس کی طرف پھرتی بہت مہمان  
نواز انداز میں ہولے سے مسکراتی تھی۔ عارض نے دائیں  
دیکھا، جہاں پنن میں مصروف گھر کی خواتین اور لڑکیوں  
کی آوازوں سے صاف ظاہر تھا کہ کسی بھی لمحے کوئی باہر  
آ سکتا تھا، پھر اس نے بائیں سمت نگاہ کی جہاں ملازمہ  
تمام بچوں کو لان سے گھیر گھار کے گلاں ڈور کی طرف قدم  
بڑھاتی دکھائی دیتی۔ ادھر ہی آرہی تھی۔ موقع اچھا تھا  
بدنامی کے فل چانسز تھے اور جہاں بدنامی ہو وہاں  
اسکیڈنڈر خود بخود جنم لے لیتے ہیں۔ اب اسے صرف موقع  
سے فائدہ اٹھا کر چند پل میں کم سے کم لفظوں کا چناؤ کر  
کے اپنی شامت کو آواز دینی تھی۔ اسے اپنے بے حد  
قریب کھڑے پا کر وہ قدرے گھبرا کے اس کی سمت  
پلٹی۔ دو قدم پیچھے ہو گئی تھی اور پھر اگلے ہی پل عارض نے  
اپنی طرف سے جیسے اس کی سماعت کو اس وضبط پر ایک  
ہم ہی بلا سیٹ کیا تھا جسے سننے کے بعد عارض کو اس سے  
پوری امید تھی کہ وہ زیادہ نہیں تو کم از کم دو پھیر تو اسے ضرور  
سیخ مارے گی کہ وہ اسی قسم کی لڑکی تھی۔ اینٹ کا جواب  
پتھر سے دینے والی یہ نہ صرف عارض کا خیال تھا بلکہ پہلے  
روز سے اب تک کا گہرا مشاہدہ بھی مگر اسے شک سا لگا یہ  
دیکھ کر کہ وہ بے جان جسم کی مانند ساکت سی کھڑی رہ گئی  
کسی ناقابل یقین منظر کو دیکھ کر ساکت رہ جانے والی  
آنکھ کی مانند پتھرائی ہوئی سی۔

”پتھر..... پتھر..... کم آن سلی گرل۔“ اس کا رواں



روٹی کی اٹھائیں کی پکار نے پر وہ حواسوں میں لوٹی  
بھی تو ساکت پلکیں قوس و قزح سے دلکش رنگوں سے  
رنگین ہوتے عارضوں پہ گراتی تیزی سے پلٹی۔

”انوشہ۔“ سخت مایوسی کا شکار ہوتے عارض نے  
ایک آخری جان توڑ کوشش سمیت اس کا ہاتھ تھام کر بے  
چینی و قدرے جھنجلاہٹ سے پکارتے ہوئے اس کے  
بڑھتے قدموں کو روک کر اس کے قہر کو جگانا چاہا مگر وہ پل  
بھر کو اس کی اس جسارت پر ہٹھک کر ساکت ہوئی۔ پھر  
اگلے ہی پل جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر  
کسی متوحش ہرنی کی طرح حواس باختہ سی اس کی دسترس  
سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ سخت مایوسی کے عالم میں گہرا  
سانس بھرتا پہلوؤں پہ ہاتھ ٹکا کے سرفنی میں ہلا کے رہ  
گیا۔ پھر اس نے ارد گرد نگاہ ڈالی پکن سے لڑکیاں  
افطاری کے لوازمات سے سچی ڈشز اٹھائے باہر آرہی  
تھیں۔ ملازمہ بھی پانچ عدد بچوں کے ہنگامہ خیز جلوس  
کے ساتھ اندر آچکی تھی۔ عارض نے نمیش کی سامنے کی  
جیب سے نماز کی سفید جالی وار ٹوپی نکال کر سر پر جمائی اور  
ایک مرتبہ پھر سخت مایوسی کے عالم میں سرفنی میں ہلاتا دادا  
جان کے کمرے کی طرف پلٹ گیا۔

”عارض بھائی! آپ ناحق اتنے پریشان ہوئے  
سیدھے سبھاؤ مجھ سے اپنا پرابلم شیئر کر لیتے میں آپ کی  
خدمت میں اس سے زیادہ اچھے اور بہتر آئیڈیاز پیش  
کر سکتی تھی پھر آپ مجھے عمر بھر داد دیتے رہتے۔“  
”تم تمہیں برا نہیں لگا۔ غصہ نہیں آ رہا تمہیں مجھ  
پر۔“ یہ لڑکی ایک بار پھر اسے حیران کر گئی تھی۔

”لیجئے اس میں برا ماننے والی بھلا کیا بات ہے اپنی  
ذات کو مشکل کٹھنائیوں بے سکونی یا وقت کے گرداب  
میں دھنستا محسوس کر کے تو جانور بھی مزاحمت کے بے  
اختیاری رد عمل سے دوچار ہو جایا کرتے ہیں تو آپ تو پھر  
ایک انسان ہیں اور رہ گئی بات میرے غصہ کرنے کی تو  
آپ نے وہ سنا نہیں کہ جو گرجتے ہیں وہ ہرستے نہیں میں  
غصیلی ضرور ہوں مگر غلط بات پر غصہ آتا ہے مجھے یوں ہی

بات ہے بات بلا وجہ کاٹ کھانے کو دوڑنا میری عادت  
نہیں۔“

”کیا ہوا ابھی کس سوچ میں گم ہیں۔ آپ وہ بھی  
قدر پریشانی کے عالم میں۔“ اپنی باتوں کے جواب  
وہ اسے یگانگت گم سم سا قدرے حیرانی کے عالم  
خاموش و ساکت سا پا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتی  
مسکرا کے بولی تو عارض جیسے کسی خیال سے چونک  
انگشت شہادت کی پور سے پیشانی ملتا پھر پہلو بدل کر  
عقب میں چیئر کی بیک پر دراز کرتا سر کو ہولے سے  
میں ہلا گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر  
تھی۔

”ایکچو نیلی یہ سب..... آئی میں تمہارا اس قسم کا  
واقعی میرے لیے حیران کن ہے یونو میں تمہیں یہ  
ریسٹورنٹ میں اسی لیے لے کر آیا ہوں کہ مجھے ڈر تھا  
گھر میں تم کہیں یہ فضول سی حقیقت جاننے کے بعد  
سب کے سامنے میرا قیمہ ہی نہ کر ڈالو میرے ذہن  
تمہیں آؤٹ آف کنٹرول ہونے سے بچانے کو اس  
بہتر جگہ کا خیال ہی نہیں آیا۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں  
جیسے کسی بوجھ سے آزاد ہو کر شکر کا طویل سانس لیتا  
پڑا۔ انوشہ بھی دھیرے سے ہنستی سرفنی میں ہلا گئی۔  
”اصل میں لڑکیوں کے بارے میں کچھ اس قسم  
باتیں سنتا آیا ہوں کہ میرا ذرا اپنی جگہ صحیح بھی تھا۔“  
”مثلاً کس قسم کی باتیں سنتے آئے ہیں؟“ انوشہ  
سرسری انداز میں کریدا۔

”یہی کہ لڑکیاں اس معاملے خاص طور  
لڑکیاں اس معاملے میں بڑی حساس ہوتی ہیں۔ ذرا  
سی بات کو اپنی ضد اور انا کا مسئلہ بنا لینے والی۔“ عارض  
بات پر انوشہ نے مدھم سی مسکراہٹ سمیت ابرو اچکا کے  
”ذرا سی بات آئی تھنک یہ اتنی ذرا سی بات تو  
تھی۔ ضروری تو نہیں کہ جس بات کی میرے نزدیک  
اہمیت نہ ہو وہ بات کسی دوسری کے لیے بھی اسی قدر  
اہم سی بات ہو۔“



”اچھا پھر تو مجھے تمہیں تراویح کے بعد اصرار لانا چاہیے تھا۔“ عارض مصنوعی تاسف سے بولا تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”انوشہ میں ریلی بہت زیادہ گلی فیل کر رہا ہوں وہ سب۔“

”پلیز عارض بھائی بھول جائیے۔“ وہ فراخ دلی سے مسکراتی تو دل ہی دل میں جزبز ہوتے عارض کو مزید ندامت نے گھیر لیا۔

”انوشہ تم بہت اچھی لڑکی ہو، ویری ویری نائس گرل۔“ اس نے میز کی شفاف چکنی چمکدار سطح پر دکتے اس کے دودھیا گلابی گداز موئی ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ کو ہولے سے دبایا۔ انوشہ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ مدہم پڑ گئی۔

”لیکن آپ بالکل بھی اچھے لڑکے نہیں ہیں۔“ انوشہ اس کے مضبوط ہاتھ تلے دبے اپنے ہاتھ کو آہستگی سے کشادہ ہتھیلی کے بوجھ سے آزاد کراتی ہوئے سے ہاتھ پھینکتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب چلیں؟“ سر پر آنچل درست کرتی وہ سوالیہ نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

”ہاں چلو۔“ عارض بٹاشت سے مسکراتا میز سے گاڑی کی چابیاں اٹھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے۔“ اس کے سنگ سنگ قدم اٹھاتے سیڑھیوں سے گاڑی تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے معلوم نہیں کیسے بے دھیانی میں وہ توازن کھو کے بری طرح لڑکھڑائی تھی اور ایسے میں بالکل بے اختیاری طور پر دو دراز مضبوط بازوؤں نے اسے سنبھال لیا۔ انوشہ کو اپنا سر اپا کسی اہنی قفس میں جکڑتا محسوس ہوا تھا۔

”سنبھل کے۔“ عارض نے اس کے قدموں میں جھولتے آنچل کے پلو کو اس کے نازک شانے پر ڈالا اسی پلو کے ہیل تلے دب جانے سے اس کے قدم ڈمگ گئے اور لڑکھڑاکے لہراتا سر اپا عارض کی گرفت میں پل بھر کے لیے بکھر کے سمٹا تھا۔

”یہ بھی سچ ہے اور یہ بھی کہ ہر کوئی دکھاوے کی محبت کے جال میں پھنس جانے والا نہیں ہوتا۔“ اس کا انداز انوشہ کو سراہنے والا تھا۔

”دکھاوے کی محبت۔“ اس کی بات پہ انوشہ پھیکے سے انداز میں ہنس پڑی۔ پھر پل بھر کی خاموشی کے بعد وہ اس کی مسکراتی آنکھوں میں تنگ دھیرے سے مسکراتی چلی گئی۔

”یہ دکھاوے کی بھی کوئی محبت ہوا کرتی ہے کہیں محبت تو فقط محبت ہوتی ہے۔ ہم تو یہی سنتے آئے ہیں۔ ہر انسان کی اپنی اک سوچ ہوتی ہے اب معلوم نہیں آپ کے لیے محبت کیا اور کیسی ہے لیکن جہاں تک ہم سنتے آئے ہیں تو محبت تو ایک راز ہے ایک ایسا گہرا پاک معصوم راز جو بد عملی اور غرض ہوس کی آلائشوں سے پاک ہے فطرت کا وہ پیغام جسے گناہ سے پاک ہاتھوں نے خدا کے نیک اور مقبول بندوں کے لیے تیار کیا ہے۔ محبت تو وہ معصوم تبسم ہے جو تاریک دنیا سے دور کسی جزیرے کے اندر رہنے والی معصوم پاک پریوں کے نازک ہونٹوں پر نمایاں ہوتا ہے محبت معصوم پاکیزہ پھولوں کا اک خوب صورت نازک بے پناہ حسین بے حد دلکش سہرا ہے۔ جسے بہشت کی حوروں نے فردوس کے باغات سے بنایا ہے۔ محبت ایک گداز نازک جذبہ ہے ایسا جو آنکھوں سے دل میں اور پھر دماغ پر چھا جاتا ہے۔“ بے حد مضبوط پراعتماد لہجے میں بولتی وہ اسے لاجواب کر گئی تھی۔

”تمہارے لیے کیا منگو اوں؟“ کتنے ہی پل دنگ رہ جانے کے بعد وہ جب سنبھل کر بدقت تمام ہولے سے مسکرایا تو اس سوال کے علاوہ وہ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں ہرگز نہ رہا تھا۔

”سوری عارض بھائی میرا بالکل بھی کچھ کھانے منے کا موڈ نہیں وہ تو آپ کے اصرار کی وجہ سے میں چلی آئی، افطاری میں اتنا کچھ کھا چکی ہوں کہ اب مزید ایک گھونٹ پانی کی بھی گنجائش نہیں کم از کم تراویح جیسی منزل طے کرنے سے پہلے تو بالکل بھی نہیں۔“



”سوری۔“ ہاتھوں کا حصار کھولتے عارض کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔ عارض کے چہرے پر نرم دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ انوشہ کے رخساروں پر حیا کی متماہٹ آگئی۔

☆☆

”انوشہ! کہاں ہو؟“ جمین اور نگین کی بار بار بڑنے والی پکاروں پر بھی اس کے ساکت وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی تھی، ”بھی نگین کمرے میں آگئی اور اس کے ساتھ چلائی ہوئی جمین۔“

”لیجئے محترمہ ادھر مراقبے کے بھنور میں انکی ہوئی ہیں اور ادھر ہمارا گلا بیٹھ گیا ہے پکار پکار کے۔“

”خدا کی پناہ مسئلہ کیا ہے تم دونوں کے ساتھ۔“ ان دونوں کے یوں آندھی طوفان کی طرح بیڈروم میں داخل ہونے پر چیئر کی بیک پر رکھے سر کو اٹھا کے بند پلکیں وا کرتی جھنجھلائی نظروں سے تکتی بے زاری بھرے انداز میں گویا ہوئی۔

”کتی بار نفیسہ (ملازمہ) کو بھیجا مگر مجال ہے جو تم پر ذرا سا بھی اثر ہو جائے کسی بات کا۔“

”خیر اب میں ایسی بھی اثر پروف نہیں۔ کہا تو ہے بھئی نفیسہ کو تھوڑی دیر میں آرہی ہوں میں۔“ وہ مدھم مسکراہٹ سے کہتی پھر سے چیئر کی بیک سے سرٹکا کے پلکیں موند گئی۔ وہ اس وقت کسی سے بات کرنے بلکہ سامنا تک کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ نہ صرف قلبی کیفیت اس کے قابو سے باہر تھی بلکہ ذہن بھی بری طرح سے انتشار سے دو چار تھا۔ گہری ہوتی رات کی تاریکی اسے اپنے اندر اترتی محسوس ہونے لگی۔

”نفیسہ نے تو کہا تھا کہ تمہارا موڈ نہیں ہے نیچے جانے کا۔“ نگین بولی۔

”وہ تو میرا موڈ واقعی نہ تھا ابرار صاحب سے بات کرنے کا مگر تمہارے ساتھ چلنے سے تو انکار نہیں کیا۔“

”ابرار صاحب؟ وہ تمہارے بھی کچھ لگتے ہیں انوشہ آئی تھنک وہ شخص تمہارا باپ ہے۔“

”گئی ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم ندا کے کمرے کے میرے سر میں ابھی شدید درد ہے ابھی پانچ من میں کچھ آرام آجائے گا۔ میں پین کمرے چلی۔“ بے نیاز انداز پرہیز جمین بات کاٹ گئی۔

”دیکھا..... دیکھا تم نے ایسا ہی کرتی ہے بھی ابرار چچا کا فون آتا ہے کب تک جھٹلاؤ گی تم ابرار خون کے رشتے ہیں یہ تمہاری سر دمہری کی اس قدر آسانی سے نہیں چڑھ سکتے۔“ جمین نے دیکھا پھر براہ راست اسے گھورتے ہوئے ایک چبا کر کہا تو انوشہ یونہی بند پلکوں سے مسکراتی چہچہے جھلاتی رہی۔

”سچ کہتی ہے جمین، انوشہ جب کسی انسان کی آپ کی ذات کا احساس ہو جائے تو.....“

”تم دونوں مجھے کچھ دیر تنہا نہیں چھوڑ سکتیں پلو۔“ کتنی بے حس ہو گئی ہو تم انوشہ کچھ ایسا ویسا خدا خواستہ تو دیکھنا سر پکڑ کے روؤ گی تم لکھ میری یہ بات۔“ جمین کے خفگی سے کہنے پر انوشہ ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

”جو بھی ہونا ہے۔ وہ تو..... طے کیا جا چکا ہے۔ طے کیا جا چکا ہے وہ ہی ہوگا اس میں نہ کوئی شک شبہ جو بھی ہوتا ہے وہ طے شدہ ہے مگر جو کیا جاتا ہے انسان کی اپنی ایک پلاننگ ہوتی ہے نہ یہ مقدر آوری ہوتی ہے نہ ہی قسمت کی خرابی کیونکہ جو ہوتا تو فقط اس پاک و برتر عظیم ذات کی طرف سے۔ مگر جو انسان آپ ہی کرنے کی ٹھان لیتا ہے وہ اپنی منشا یا ضد ہوتی ہے۔ جس میں کبھی بھی حد نہ حساسیت اور انصاف سمایا ہوتا ہے اور کبھی رتی باری انسانیت نہیں ہوتی اور کیا تم جانتی ہو کہ انسانیت اس مقام پر کھودیتا ہے جب وہ فقط اپنی ذات کے لیے سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ سوچنا بعد آنکھ کھلنے سے لے کر دوبارہ میٹھی میٹھی مہر کی کی بانہوں میں دنیا و مافیہا کو بھلا کر سکون سے



بولتے ہوئے پل بھر کو پلکیں وا کرتی وہ نہ معلوم کس کا  
مضحکہ اڑاتی مسخرانہ انداز میں ہنس رہی تھی اور اگلے ہی  
پل وہ چیئر جھلانا بھول گئی نازک ہونٹوں پہ چبھتے خود آزار  
سی ہنسی کے نازک غنچے بے ساختہ ہونٹ پہنچنے لگے  
باعث شہنمی گداز میں پیوست ہوتے گامی ریشمی سلوٹوں  
میں معدوم ہو گئے جو بلند سحر طراز سراپا بند پلکوں تلے کنول  
نمیوں کی شفاف جھیلوں میں اک گہرا ارتعاش بکھیر کر  
اسے آنکھیں وا کر دینے پہ مجبور کر گیا تھا۔ وہی اب شپٹا  
دینے والی حقیقت سمیت نظروں کے سامنے تھا۔ انوشہ کو  
دھڑکنوں اور رگ رگ میں گردش کرتے لہو میں اک پر  
تپش سی سنسناہٹ تیزی سے پھیلتی محسوس ہوئی وہ  
نامعلوم کب سے دروازے کے وسط میں بت بنا کھڑا  
تھا۔

”عارض بھیا آپ..... آئیے ناں؟“ اس کی نظروں  
کے تعاقب میں دیکھتی نکلین اور جبین کے چہرے پہ  
خوشگوار سی مسکراہٹ چھا گئی۔ جبین کی آفر پر وہ یونہی  
ساکت پلکوں سے ایک ٹک انوشہ کو تکتا رہا تھا۔ وہ یگانگت  
شپٹا کے چہرہ مخالف سمت میں پھیرتی اضطراری انداز  
میں چیئر کے ہتھوں پہ گرفت مضبوط کرتی تیزی سے  
پلکیں جھپک کر آنکھوں میں نامعلوم کسی احساس کی چمک  
کو ماند کرتی عارض کو ایک شفاف پرسکون جھیل کی مانند  
لگی تھی جس کے سکون و سکوت کو توڑنے کے لیے اس  
کے ساکت پانی میں پتھر پھینک کر شفاف پانی کی سطح  
سے جھانکتے ارد گرد کے تمام مناظر کو یکدم بکھیر دیا  
جائے۔

”ہم ابھی تھوڑی دیر میں آرہے تھے عارض بھیا۔“  
ان تینوں کی مشترکہ دوست ندا کی طبیعت کچھ ناساز  
تھی اس نے شام میں ہی فون پر نکلین کو اپنی خرابی طبیعت  
سے آگاہ کیا تو ان دونوں نے فراغت پاتے ہی اس کے  
گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ تمام مرد حضرات تو مسجد گئے  
ہوئے تھے۔ عارض نے سب سے پہلے گھر میں قدم رکھا  
تھا۔ جبین نے گرما گرم چائے کے کپ سمیت بڑے لاڈ

موند لینے تک اس کی ہر سوچ ہر فیصلہ اپنی ذات کے لیے  
ہوتا ہے۔ اپنے لیے صرف اور صرف اپنے لیے اور یہاں  
اس مقام پر وہ اپنے ہی دل کے ساتھ بھی درندگی پر اتر آتا  
ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنی ہی  
ذات کو مسخ کرنے کا ارادہ باندھ لیتا ہے اور سب سے پہلی  
گرہ فضول سی اندھی گوئی، بھری انا کی لگاتا ہے پھر خود  
غرضی مطلب پرستی، ناشکری، ناجائز خواہشوں، بے حسی،  
کینہ و تکبر، غرور بے جا ضد، من مانی، بے رحمی، سنگدلی،  
مکاری بے حسی اور پتھر یلے فیصلوں کی۔“

”افسوس کی بات ہے بڑے افسوس کی..... تم اپنے  
باپ کے لیے اس قسم کے خیالات رکھتی ہو۔“ جبین نے  
اسے تاسف بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے سرفنی میں  
بلایا۔

”باپ کے لیے نہیں انسانیت سے عاری ایک  
انسان کے لیے۔“

”زیادتی بہر حال ابرار پچا کے ساتھ بھی تو ہوتی تھی۔  
حدیقہ چچی ان کی محبت تھیں۔“ جبین یقیناً ابرار کی جذباتی  
لفظی سے اچھی خاصی متاثر ہونے کے بعد ان ہی کی  
زبان بولنے لگی تھی۔ انوشہ کے چہرے پر مسکراہٹ گہری  
ہوتی چلی گئی مگر من میں تیزی سے کچھ جھلنے لگا تھا۔

”ہاں محبت اور مرد جب محبت کرتا ہے تو دل و جان  
سے کرتا ہے دل و جان سے ہی نہیں دل کی تمام تر  
گہرائیوں، عزت و احترام، فخر و استحقاق اور بھرپور توجہ کے  
ساتھ کرتا ہے مگر افسوس کہ مرد محبت کرتا ہے محبت ہو جائے  
تو اس محبت کی حقیقت اس کے لیے سوائے موکی بخار کے  
اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ محبت ہونے سے محبت کرنا  
اس کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہاں اس مقام پر  
آکر وہ اپنی مردانگی کو بھول جاتا ہے یعنی مرد نہیں رہتا،  
انسانیت سے عاری سفاک درندہ بن جاتا ہے۔“

”بظاہر پرسکون ملائمت آمیز ٹھہرے ٹھہرے لہجے  
میں سچ حقیقتوں کا زہر تھا، نرم لب و لہجے میں عجیب  
اضطراب و شائستگی تھی۔ مدھم مگر بڑے کاٹ دار انداز میں



سے اسے کارڈرائونگ کی فرمائش پیش کی جس کو عارض نے بڑی فراخ دلانہ مسکراہٹ سمیت پورا کرنے کی ہامی بھری تھی کہ رات کو ان کے تنہا جانے پہ تو خود اسے بھی اعتراض تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب چلیں دیر سے جائیں گے تو واپسی میں بھی دیر ہو جائے گی۔“ وہ دو قدم آگے بڑھا آیا۔  
 ”اٹھو انوشہ پہلے ہی تمہاری وجہ سے کافی لیٹ ہو چکے ہیں ہم اگر دادا جان آگئے تو وہ کسی صورت بھی اس وقت ہمیں جانے نہیں دیں گے۔“ لیکن نے کہا۔  
 ”جی! تم دونوں جاؤ، پلیز میری طبیعت ٹھیک نہیں، ندا کو میری طرف سے پوچھ لینا، میں کل اس کی طرف جاؤں گی۔“

”او کے۔“ اس سے مزید کوئی بحث عارض کے سامنے مناسب نہ سمجھتے ہوئے وہ دونوں بس اسے خستہ گلیں انداز میں گھورتی رہ گئیں۔

”عارض بھیا، پانچ منٹ پلیز ہم ذرا بکے اور فروٹس وغیرہ لے لیں۔“ وہ دونوں عارض سے ریکویسٹ کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ وہ ان کے پیچھے جانے کی بجائے وہیں کھڑا رہ گیا تھا اس کی نگاہیں ایک بار پھر سابقہ پوزیشن میں بیٹھی بے نیازی انوشہ کی بند پلکوں میں الجھتی گئیں اور شاید ان ہی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے اس کی پلکیں ہولے سے لرز کے واہوئی تھیں اور پھر ان سونی جاگتی مخموری آنکھوں سے نگاہ ملتے ہی انوشہ کو اپنے چہرے پر پھیلتی تپش میں عجیب خنکی سی سرایت ہوتی محسوس ہونے لگی۔

”آپ گئے نہیں؟“ انوشہ کے لبوں پہ مدھم سی مسکراہٹ لرزی۔

”کیا تمہیں میرے جانے کا انتظار ہے؟“ نا معلوم ایسا کیا تھا عارض کے مدھم مسکراتے لہجے میں کہ وہ قدرے گڑبڑا کے سیاہ پلکوں کے ریشمی جال نامانوس سی حدت سے گچھلتے موی عارضوں پر گرائی یکنخت اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کسی کی غلطی کو دل سے معاف کر دینا فراخ دلی ہی نہیں اعلیٰ ظرفی بھی کہلا۔“ وہ یقیناً اس کے آخری الفاظ کو اچھی طرح جانچ چکے۔

”میں نے کسی سے کہا تو نہیں۔“ وہ ہچکچائے سے انداز میں نگاہ چرائی اس کی بات کاٹ گئی وہ قدم بڑھا کر قریب آ گیا تھا۔

”اچھی بات ہے کسی سے کہنا بھی مت ورنہ میں بدنام ہو جاؤں گا۔“ وہ بے تحاشہ ہنستی شوخ نگاہوں سمیت چہرے پر معصوم سی گھبراہٹ طاری کر کے سرگوشی کرتا انوشہ کے اندر کی جلالی سی لڑکی کو بیدار کر گیا۔ اس سے قبل کہ وہ باریک تراش والے لبوں کے گداز گوشوں میں دبی مسکراہٹ کو کسی خونخوار پھری بلی کی مانند جھپٹا مار کر نوچ پھینکنے کی خواہش پر عمل کرنے کے بارے میں سوچتی وہ یکنخت ایڑیوں پہ گھوم کے پلٹتا سر پہ رکھی کروشیے کے باریک نقیس کام والی سفید جالی دار ٹوپی اتار کے کرتے کی جیب میں ڈالتا کمرے سے نکل گیا۔

”لفنگا..... لوفر.....“ وہ مٹھیاں بھینچ کر شدید طیش کے عالم میں دانت پیس کے رہ گئی۔ معلوم نہیں کیوں وہ بار بار اس کا لحاظ کرنے پر اس قدر مجبور ہو جاتی تھی۔ اب بھی وہ اس کے کاٹن کے کلف لگے لائٹ کافی کلر کے شلوار کرتے میں مزید نمایاں ہوتے کشادہ بلند سراپے کو دور ہوتے دیکھ کر گھورتی آنکھوں سمیت بے بسی سے فقط ہونٹ کاٹ کے رہ گئی تھی۔



”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں، وہ بھی اس بے حسن، خود غرض شخص کے لیے۔“

”انوشہ..... کتنی بار سمجھایا ہے کہ تم اس قسم کے الفاظ مت استعمال کیا کرو۔ وہ شخص جیسا بھی سہی مگر تمہارا باپ ہے۔“

”بد قسمتی سے۔“ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔



میری بات جیسا اس طرح نہیں کہتے۔ ”اور باپ نے  
ماعت سے ڈپٹا انوش ایک گہرا ادھورا سانس بھرتی ان  
کے قریب آ بیٹھی پھر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام  
کر چومے۔  
”امی! آپ نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں امی

میں ”میری بیٹی میں تمہارے اور ان کے بیچ کسی بھی قسم  
کی دیوار حال نہیں کرنا چاہتی تم پر ان کا حق ہے بیٹا اور تم  
پر ان کے حکم کی تعمیل فرض۔“  
”بس کیجیے امی یہ حقوق یہ فرائض اب یاد آئے ہیں  
نہیں۔“

”چلو فون پر بات کرنے میں کیا حرج ہے؟“  
درختاں کسی لمبی بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تھیں اس لیے  
نری سے بات بدل گئیں۔  
”مجھ میں نہ تو آپ جتنی ہمت ہے نہ ظرف۔“ وہ  
روکھائی سے بولی۔

”انوشہ معاف کر دینا خدا کو پسند ہے اور معاف  
کرنے والا بھی اس کے پسندیدہ ترین بندوں میں شمار کیا  
جاتا ہے بیٹا۔“

”میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے نہ کرنے والی  
امی! آپ نے معاف کر دیا تو مجھے میں نے بھی معاف  
کر دیا مگر جو وہ چاہتے ہیں تو..... نیور  
امی..... امپا بل۔“

”وہ بہت شرمندہ ہیں انوشہ بے حد نامدہ پھر میں بھلا  
انہیں کیوں نہ معاف کر دیتی اتنے برس حدیقہ کی خالی  
سوئی رہنے والی گود اور پھر ان کی اچانک موت نے ابرا کو  
بالکل توڑ پھوڑ ڈالا ہے۔“ انوشہ ان کی یہ بات نظر انداز کر  
گئی۔

”ہاں جب کہ آپ کو ان کے شرمندہ ہونے کا انتظار  
بھی تھا۔ ایک عمر گنوا دی آپ نے قیمتی ماہ و سال کی خوب  
صورتیاں شادا بیاں تیاگ دیں اپنے انمول حسین  
جذبے اپنے معصوم شفاف احساسات اپنی ہنسی زندگی

سے بھر پور مسکراہٹیں اپنے ہنسون بھریے دل کی  
آرزوئیں اپنی روح کی رنگینیاں بھی کچھ تو بچ دیا۔ آپ  
نے فقط ان کے ایک لفظ سوری سننے کی آس میں امی ایک  
عمر ہی نہیں کیا کچھ نہ گنوا دیا۔ آپ نے ان کی اس چند  
لمحائی شرمساری وندامت کے احساس سے دو چار ہونے  
کی امید میں۔“ اس کی بات پر چند لمحے کی خاموشی کے  
بعد وہ ہولے سے مسکرا دیں۔

”مجھے ایسی کوئی آس امید یا انتظار نہ تھا۔ بس جو بھی  
میرے ساتھ ہوا میں نے اسے اپنی سیاہ بختی سمجھ کر اور خدا  
کی رضا جان کر تسلیم کر لیا۔“

”سیاہ بختی..... خدا کی رضا..... امی کیا خدا کی رضا  
کسی ایسے سنگدلانہ فیصلے میں نہیں ہو سکتی ہے جو ایک  
ساتھ کئی زندگیوں کو ہر باد کر ڈالے کتنے ہی دلوں کو توڑ  
ڈالے وہ تو رحیم و رحمن ہے ستر ماؤں کے برابر اپنے  
بندوں سے شفقت و محبت رکھنے والا اور ستر میں سے کتنی  
مائیں ہوں گی جن کی رضا اپنی اولاد کے اجر نے میں ہو  
گی یہ بھی خوب ہے امی کسی کو خوشی مل گئی تو یہ اس کا حق  
اور جو کوئی نامراد رہا تو اس کی نامرادی خدا کی رضا کہلائے  
کیوں امی آخر کیوں کیا ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی رضا  
کس بات میں ہو سکتی ہے۔ تو پھر ہم کیوں اپنے ہی جیسے  
بندوں کے کیے گئے کھوکھلے دو غلے فیصلوں کی سفاکی اور  
بے حسی میں خدا کی رضائیں اور مصالحتیں تلاش کرتے  
ہیں۔ اگر ہم اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں سے اپنا حق  
وصول نہیں کر سکتے۔ اپنے ہی جیسے بندوں سے اپنا حق  
نہیں مانگ سکتے تو پھر خدا سے شکوے کیوں کرتے ہیں  
کیوں آنسو بہاتی تھیں آپ اپنے رب کے سامنے  
کیوں رات رات بھر سجدے میں گر کے روتی، گڑ گڑاتی  
تھیں کیوں گلے شکوؤں کے الاؤ میں اپنے صبر و ضبط کو  
جلایا کرتی تھیں؟ یہ دنیا ہے امی یہاں پہ کسی کو کچھ مانگنے  
سے بھی مل جائے تو بڑی بات ہے ورنہ تو اپنا حق بھی  
یہاں چھیننا پڑتا ہے۔“ اس نے پل بھر کورک کر ایک گہرا  
سانس لیتے ہوئے ان کے ہاتھوں پر اپنے نازک ہاتھوں



کی گرفت مضبوط کی۔

”سیاہ بختی یہ نہیں کہ کوئی آیا اور آپ کو آپ کے من کو آپ کی روح کو امیدوں کو روند کر چلا گیا۔ یہ تو خدا کی طرف سے اس کا ایک ٹیسٹ ہوا۔ امی آپ کی سیاہ بختی نہیں آپ کی سیاہ بختی تو یہ ہوگی امی کہ میں..... میں آپ کو چھوڑ کر ان کے پاس چلی جاؤں۔ عمر بھر کے لیے یا پھر چند لمحوں کے لیے ہی۔“

”تو پھر کیا چاہتی ہو تم کہ اب اگر صبح کا بھولا شام کو لوٹ ہی آیا ہے تو ہمیں اسے مایوس کر دینا چاہیے۔“ درخشاں کی آنکھوں اور لہجے میں ابھرنے آمیز جھنجھلاہٹ در آئی۔

”امی پلیز سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ وہ اگر بیمار ہیں تو بھی ان کو یہاں آنا چاہیے۔ بہر صورت اور اپنے رویوں کی اپنی بے نیازیوں کی اپنی بدسلوکی کی آپ سے معافی مانگنی چاہیے یہاں آپ کے روبرو۔ مانا کہ وہ شخص جیسا بھی ہے میرا باپ ہے امی باپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور مجازی خدا ہونے کے ناتے وہ آپ کے لیے بھی بے حد افضل ہیں مگر پھر بھی اپنی اس بڑائی کو ذرا دیر کے لیے ان کو بھولنا تو پڑے گا ہی کہ بہر حال چھوٹوں کے سامنے جھکنا تو پڑتا ہے چاہے ان کو مار لگانی ہو یا انہیں سینے سے لگانا ہو جب پہلا کام بخوبی کر چکے ہیں تو پھر دوسری پیش قدمی کے لیے اس قدر تردد کیوں؟“ آخری فقرے کہتے ہوئے انوشہ کے چہرے پر ایک تھکی تھکی سی مدھم مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو تم نہیں جاؤ گی؟“

”ہاں یہ ہو ہی نہیں سکتا اور آپ بھی نہیں جائیں گی امی پراس کریں مجھ سے۔“

”یہی تو مشکل ہے میرے لیے شعور بھائی سامع بھائی اور بابا جان کا بھی یہی حکم ہے اور ادھر تم یہ میری کسی بات کا اثر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔“ ان کے انداز و لہجے میں جھنجھلاہٹ بھری بے بسی تھی۔

”معلوم نہیں ان کا کوئی خیال رکھنے والا بھی ہے وہاں

کہ نہیں۔“ وہ یوں ہی جھنجھلائی متفکری خفگی بھرے انداز میں اس کے ہاتھ جھٹک کر اٹھتی وہاں سے چلی گئیں۔

”کتنی کٹھور اور ضدی ہو تم انوش اگر میری اماں جان مجھے جان دینے کا حکم بھی دے دے دس ناں تو پل بھر کی تاخیر نہ کروں میں تو۔“ اب تک مسلسل خاموش بیٹھی بول پڑی۔

”کیا تمہیں لگتا ہے گی کہ یہ وہ ہی درخشاں ابرار ہے جو اپنے شوہر کی تصویر سے ہمکلام ہو کر اس سے شکوے کرتی اتنے برسوں تک الجھتے بکھرتے ہوئے اپنی جوانی کی دلکشیوں سے لبریز انمول ساعتوں کو آنسوؤں کی صورت ان پر لٹاتے ہوئے خود سے ہر روز ان کو بھی معاف نہ کرنے کا عہد کرتی رہی ہیں۔“

”اسی کو وفا کہتے ہیں میری جان وفا خواہشوں چاہتوں کی حسین رنگین وادیوں میں جنم لینے والے بظاہر بے حد نازک مگر درحقیقت بے پناہ حسین بے حد مضبوط اور انمول جذبے محبت کی مہکتی مہرکائی پر طمانیت و پرحدت نرم مہربان آغوش میں سانس لیتے نازک و معصوم سے احساس چاہت کی خوابیدہ پلکوں میں مقید رہنے والا خدا کا اک پر نور تحفہ جو پھوپھا جان کی زندگی کی بلاشبہ اک بڑی خوش نصیبی ٹھہرا اور نہ کیا پھوپھا جان کی منتیں التجا میں ان کو طلاق جیسا بے رحمانہ فیصلہ کرنے سے روک پائیں بھلا۔“

”بے چاری عورت بظاہر خود کو بڑا مضبوط سمجھتی ہے اور عقل مند بھی مگر درحقیقت بے حد بے وقوف اور کس قدر کمزور ہوتی ہے اور اسے اپنی بے وقوفی بے مائیگی اور بے بسی کا علم تب ہوتا ہے جب وہ اپنی خواہشوں کے رلنے اور چاہت کے راکھ ہونے کی ناکامی کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے اور تب وہ جان مان اور سمجھ لیتی ہے کہ وہ کس قدر بے مایا اور کتنی بے بس ہے۔“

”خیر سب مرد تو اس قسم کی بھیانک فطرت کے مالک نہیں ہوتے۔“

”جو ہوتے ہیں میں نے فقط ان کی بات کی ہے۔“



کھل کر پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

آدم بے زار سے لگتے ہیں عارض بھیا وہ لڑکی توں ہوگی کیسی ہوگی میں تو اسی اشتیاق میں مری جا رہی ہوں چکی..... کیا خبر لندن میں ہی کسی ہوش رہا کافر ادا گوری پر مرٹے ہوں اور بے چاری ستارہ آنٹی ان کو ادھر قید کرنے کا سوچتی ہی رہ جائیں۔“

”پوچھ لیا ہوتا ان ہی سے کہ کس کافر ادا ہوش رہا کی زلفوں کی زنجیروں میں جکڑے گئے ہیں۔“ نگیں کی بے چینی اس کے چہرے پہ لفظ بھر کو مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

”ہاں جیسے وہ مجھے بتا ہی تو دیں گے پکے گھنے ہیں یہ بھی مجھے خود ہی معلوم ہو گیا اپنی ہی دھن میں ذیشان کے روم میں گھستی ہی چلی گئی جب ذیشان کے ساتھ بیٹھے عارض بھیا مجھے اندر آتا دیکھ کر یکدم خاموش ہو گئے یہ کہتے کہتے کہ ”تو ہمیں بھی عشق ہونے لگا ہے۔“ بس اسی قدر

سن پائی میں اف ان کی آنکھوں کی چمک اور وہ ان کے چہرے پہ دلفریب سی مسکراہٹ غضب کی تھی جی تو چاہا خوب خوب کرید کر نام اگلوالوں مگر ذیشان کا پتا ہے ناں تمہیں جو ذرا سا بھی اپنی پرائیویسی میں کسی کی مداخلت برداشت کر جائے خاص طور پر جب یہ لڑکے لوگ سب سے الگ تھلگ ہو کے اکٹھے ہوئے بیٹھے ہوں تو ذیشان تو بالکل ہی کٹ کھنا بلا بن جاتا ہے۔ کہتا ہے سو طرح کی باتیں ہوتی ہیں لڑکیاں بھلا اچھی لگتی ہیں بلا وجہ مرد لوگوں کی آپس کی کمپنی میں فضول میں ٹامک ٹویاں مارتی ہوئی۔“ نگیں اپنی ہی رو میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

”نہ جانے تمہارا اگلا شکار تمہارے یہاں سے فرار کا بہانہ اب کس بے چاری لڑکی کی بے ضرر سی ذات ٹھہری ہے۔“ وہ سوچ رہی تھی نا معلوم کیوں ہاتھوں پہ کسی مضبوط ہاتھ اور کشادہ میلی کا سپاٹ پر حدت سانس جاگ اٹھا تھا جو دن کے اجالے میں اسے اضطراب کی دلدل میں اتارے رکھتا تھا اور ہر شب میں بے چینیوں کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف دھکیل دیا کرتا تھا اور نازک شانوں

داردروب کھول کر مطلوبہ سوٹ کی تلاش میں گاہ دوڑاتی انوش اس کے چڑ کہنے پر ہولے سے ہنس پڑی۔

”اور یہ اپنے عارض بھیا کس قسم کے مردوں کی کٹیگری میں شمار ہوتے ہیں۔“

”میں کیا جانوں؟“ پل بھر کے لیے وہ نگیں کے سوال پر ہنسی مگر اگلے ہی پل ازلی لا پرواہ سے انداز میں شانے اچکا گئی۔

”کیوں؟ تمہیں تو بڑا دعویٰ ہے اپنی وہ کیا کہتے ہیں اسے بندہ شناسی نظر شناسی پر۔“

”نارمل سا بندہ ہے بھئی۔“ وہ آری کے نازک نیل کے کام والا جارجٹ کا پلین پر پل کلر کا سوٹ نکال کر اسی کے پاس صوفے کی طرف چلی آئی۔ آج اس کا ارادہ ندا کی طرف جانے کا تھا۔

”لیکن یہ نارمل سا بندہ آج کل کچھ کچھ ایب نارمل سا بندہ دکھائی دینے لگا ہے۔“

”کیا مطلب؟ وہ بے اختیار چونک کر سوٹ صوفے کی پشت پر ڈالتی اس کے مقابل بیٹھ کر اسے سوالیہ نگاہوں سے تنگے لگی۔

”کوئی عشق و شوق کا چکر لگتا ہے۔“ نگیں دلچسپی سے مسکرا رہی تھی۔

”ہیں..... کیا.....؟“ انوشہ کو حیرت کا جھٹکا سا لگا مگر اگلے ہی پل وہ نا معلوم کیوں نظر چراتی بے ساختہ پہلو

ت بے حد بے وقوفی سے اپنی بے وقوفی بے وقوفی سے دہرا دے گئی۔

”کیسی دھانسو خبر ہے ناں؟“ نگیں کو اس کی حیرت

”نہ صرف بکو اس بلکہ حیرت انگیز بھی۔“ وہ صوفے

کے ساتھ ہم رنگ دوپٹے کے

”کیوں بھئی خیر سے جوان جہاں بندہ ہے۔ کیا وہ

”نا معلوم کیوں یہ خبر انوشہ

”مضطرب ہواٹھنے والے دل کے گداز گوشوں پر

مندی ہو تم انوش اگر میری اماں

”اب تک مسلسل خاموش رہی

ہے گی کہ یہ وہ ہی درخشاں

”وہ تک الجھتے بکھرے ہوئے

”ہوئے خود سے ہر روز ان

”میں میری جان وفا

”وادیوں میں جنم لینے والے

”ت بے پناہ حسین بے حد

”سکتی مہرکائی پر طمانیت

”انس لیتے نازک دم

”ہ پلکوں میں مقید رہنے

”با جان کی زندگی کی باز

”یا پھو پھو جان کی مٹیں

”فیصلہ کرنے سے روک

”ظاہر خود کو بڑا مضبوط

”ت بے حد بے وقوفی سے

”جب وہ اپنی خواہش

”ہونے کی ناکامی کا تڑپی



کے گرد سورج کے سلگتے سلگاتے ہالے کی مانند کسی کے بازوؤں کا مضبوط حصار راتوں کو اسے سوتے میں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا اور اس کی سائیں اس کی دھڑکنیں کسی ٹوٹ جانے والی مالا کے بکھر جانے والے موتیوں کی طرح منتشر ہی ہو کے رہ جاتیں۔

”مجھ سے محبت کرو گی؟“ اک گھبر بوجھل مدھم سا دلکش سا چاہتوں کی حدتیں لٹاتا پریش لہجہ اس کی روح کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا تو کبھی یہی خواب ناک سالہجہ.....

”سوری انوشہ وہ..... وہ سب نالک تھا اک فضول سا ڈراما میری مجبوری یا پھر جلد بازی میں کی گئی اک گھٹیا حرکت اک بچکانہ حماقت کچھ بھی..... تم کچھ بھی سمجھ لو اسے۔“

”ممی مجھے میرا گھر یہیں بسا کر قید و محصور کر دینا چاہتی ہیں اور میں ادھر سے فرار چاہتا ہوں“ ممی کی خواہش میری مجبوری کی اس کشمکش کے باعث مجھے تمہاری ذات کو ٹارگٹ بنانا پڑا جس کے لیے میں تم سے معذرت.....“

”اے انوشہ۔“ نگین نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر فوراً سنبھلی اور پلو چھوڑ کے ہولے سے مسکرا دی۔

”میں نے پوچھا ہے نہ اکی طرف چل رہی ہو؟“  
”ہوں چلنا تو ہے اسی لیے تو یہ ساری تیاری ہے۔“  
اس نے صوفے کی پشت پر پڑے سوٹ کی سمت اشارہ کیا۔

”ویسے یہ سوچ کیا رہی تھیں تم ابھی اتنی گہرائی میں جا کر؟“

”سوچ رہی تھی کہ بزدل لوگ عشق فرماتے ہوئے کیسے دیکھتے ہوں گے۔“ اس کے ہونٹوں پہ پھیلی مسکان میں گہرا تمسخر تھا۔

”کیا مطلب کون بزدل لوگ؟“ نگین حیران ہوئی۔

”ہاں ہوتے ہیں کچھ..... اپنے اصل سے فرار کی

خواہش رکھنے والے بزدل لوگ۔“ وہ سر ہولے سے جھٹک کر دھیرے سے ہنس پڑی۔ نگین بھی کچھ نہ سمجھنے کے باوجود شانے اچکا کے مسکرا دی۔ اسی دم دروازے پر ناک کیے جانے پر دونوں نے سر گھما کر کھلے دروازے کی سمت دیکھا اور پھر انوشہ نے یکانخت ہی شپٹا کے اس سمت سے نگاہیں ہٹا لیں۔ وہ کھلے دروازے کے فرش میں کسی تصویر کی مانند فٹ ہوا کھڑا تھا۔

”تو یہ یہ بندہ تو جیسے ہر وقت جاسوسی کے موڈ میں رہتا ہے ابھی اس کا ذکر کرو اور ابھی یہ بوتل کے جن کی طرح حاضر۔“ شپٹائی سی انوشہ کے چہرے پر کوفت آمیز جھنجھلاہٹ کی ہلکی سی پھیلتی گلابی کو عارض نے بغور نگاہیں ڈالی۔

”آئیے ناں عارض بھیا۔ وہاں کیوں کھڑے ہیں۔“ نگین خوشگوار مسکراہٹ سمیت خوش اخلاقی سے گویا ہوئی تو وہ یونہی دروازے کی بالائی چوکھٹ کو تھیلیاں جما کے قدرے آگے کو جھکا کر کھڑا پل بھر کے لیے دھیرے سے مسکرایا۔

”مجھے درختاں پھوکی تلاش میں بھیجا ہے امیر نے۔“ آئی نے۔“ اسی مدھم مسکراہٹ سمیت وہاں آنے کا مقصد بیان کیا۔ ”غالباً ان کی کسی فرینڈ کا فون ہے۔“ وہ مزید بولا۔

”پھوپھو جان ابھی اٹھ کر گئی ہیں یہاں سے انہیں بھی شاید اسی کال کا انتظار تھا۔ وہ وہیں ڈرائنگ روم میں ہی گئی ہوں گی۔ آپ آئیے تو عارض بھیا کیا یہیں کھڑے کھڑے ہی سب باتیں کیے جائیں گے۔“ نگین کے پھر سے کہنے پر وہ دو قدم بڑھا کے اندر آ گیا۔

”ابھی یہاں شاید کسی بزدل کا ذکر بد ہو رہا تھا۔“ وہ یونہی مسکراتے لہجے میں بولا تو انوشہ کا جیسے روم روم اک انجانی حدت سے پکھلنے لگا، نگین عارض کی بات پر ہنس رہی تھی۔

”کسی بزدل کا نہیں کچھ بزدل لوگوں کا عارض بھیا۔“

”ایک ہی بات ہے۔“ اس کی گہری پرسوج نگاہیں



انوش کے چہرے کے نازک نقش کو نول رہی ہیں۔  
 ”تو یہ ہے عارض بھیا اب آپ بھی انوش کی طرح  
 ایک دم بے سرو پائیا تیں کرنے لگ گئے۔“  
 بے سرو پائیا تیں بڑے کام کی باتیں۔“ وہ ہنوز مسکرا  
 رہا تھا۔ انوش کو جیسے اپنے جسم کا تمام لہو بڑی تیزی سے  
 اپنے چہرے میں سمٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی  
 اک نامانوس سی پیش سے سلگ اٹھی تھی۔ آج دیتے  
 بھاری لہجے کی پیش لودیتی آنکھوں کی حدت نے اس کے  
 رگ و پے میں طیش و جھنجلاہٹ کا الاؤ سا ساگا ڈالا  
 مسکراہٹ کی کھنک الفاظ کی معنی خیزی اس کے ضبط کا  
 امتحان ہی نہیں اس کے لیے ناقابل برداشت بھی تھی بھی  
 وہ یکنخت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اب یہاں ایک پل بھی  
 ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔

”کسی کی بزدلی کا مذاق اڑانا اچھی بات تو نہیں۔  
 بزدل لوگ بھی تو دل رکھتے ہیں، محبت کر سکتے ہیں۔“ اس  
 کے کمرے سے نکل جانے کے ارادے کو بھانپ کر وہ  
 اچانک اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ وہ اس کے لیے قطعی  
 تیار نہ تھی۔ اس لیے اس کے یوں پاس آ جانے پر اپنے  
 اندر کی جھنجلاہٹ کو وہ اپنے چہرے اور آنکھوں میں  
 جھلک آنے سے نہ روک پائی۔ نہ ان لفظوں کو لبوں سے  
 آزاد ہونے پر جو بزدل ہوتے ہیں وہ کبھی محبت نہیں  
 کر سکتے اور جب وہ محبت نہیں کر سکتے تو وہ پھر دغا کرتے  
 ہیں اور جو دغا کرتے ہیں ان کے سینے میں دل نہیں اک  
 سیاہ داغ ہوتا ہے۔“

وہ بلا جھجک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی  
 ازلی خود اعتمادی سمیت بنا کسی لحاظ و ہچکچاہٹ کے الفاظ  
 کے تیر برساتی چلی گئی۔ عارض کو پل بھر کے لیے اپنی  
 پیشانی سے اک پیش سی پھوٹی محسوس ہوئی۔

”تم..... ابھی تک خفا ہو مجھ سے؟“ اس کے قدرے  
 جھل سے انداز میں کہے گئے بے ساختہ سوال پر وہ یکدم گڑ  
 بڑا کے صوفے پر بیٹھی نکلین کو تنہی ایک بار پھر شپٹا کے رہ گئی  
 مگر اگلے پل سنبھل کر عارض کو گھورا۔

”مہلتیے میرے رات سے۔“  
 ”بہت جاؤں گا مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری ناراضگی  
 کیسے دور ہوگی؟“ قدرے منتظر سا انداز حد درجہ سنجیدگی  
 لیے ہوئے تھا۔

”میری..... میری بھلا آپ سے کیا ناراضگی۔“ وہ  
 یکنخت اپنے غصے پر قابو پاتی ہو لے سے منمننا کے نگاہ چمکا  
 گئی۔

”میری طرف دیکھ کر کہو یہ بات۔“ غیر متوقع  
 فرمائش پر انوشہ کا تو جیسے دماغ ہی بھگ سے اڑ گیا۔  
 ”عارض صاحب..... باتوں کے جال میں پھنس  
 جانے والی، لفظوں کے ریشم میں الجھ جانے والی بہت  
 لڑکیاں دیکھی ہوں گی آپ نے مگر میں ہرگز ایسی لڑکی  
 نہیں ہوں۔ مانیڈاٹ۔“ نامعلوم کیوں اس کا ضبط  
 جواب دے گیا۔

”ہوں جانتا ہوں کہ تم ایسی لڑکی نہیں ہو بلکہ ویسی  
 لڑکی ہو۔“ عارض کے لبوں پر پر لطف سی مسکراہٹ بکھر  
 گئی۔ انوشہ نے بے تحاشہ سلگ کر اس کی بات کے  
 جواب میں کچھ کہنے کو لب کھولے۔

”ایسی کی تیسری کر دینے والی۔“ وہ مزے سے  
 مسکراتے ہوئے کہہ گیا اور پھر اسے سخت بے بسی مگر  
 جھنجلائے ناگواری کے سے انداز میں اپنی سمت گھورتے  
 یا کر عارض کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ یکنخت گہری ہو  
 گئی اور بھاری لہجے کا ترنم بکھرتا چلا گیا۔

”فرض کرو اس جوگ بجوگ کا ہم نے ڈھونگ رچایا ہو  
 فرض کرو بس یہی حقیقت باقی سب کچھ مایا ہو  
 فرض کرو یہ روگ ہو جھوٹا، جھوٹی پیت ہماری ہو  
 فرض کرو اس پیت کے روگ میں سانس بھی ہم پر  
 بھاری ہو۔“

”گھٹیا، بے ہودہ، چیڑ، دیکھ لوں گی میں اسے  
 بھی..... اچھی طرح..... سمجھتا کیا ہے خود کو اور..... اور  
 آخر کیا سمجھ رکھا ہے اس نے مجھے۔“ چند ہی لمحوں بعد وہ  
 زخمی شیرنی کی طرح غیظ و غضب کے سے عالم میں ادھر



اوسر ٹہل رہی تھی اور اسے لہجے کی گھبراہٹ میں الجھا کے لفظوں کے سحر میں ڈبو کر دم بخود سی چھوڑ کر اس کے کمرے سے نکل کر کوریڈور کی سمت پیش قدمی کرتے عارض نے سرفنی میں ہلا کر بے اختیار بے آواز ہنسی سمیت خود کو اتنے زبردست القابات سے نوازے جانے پر اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیے تھے۔

”ہائے انوش تو... وہ تو ہے۔“ نگین جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت سے نکل کر خوشی سے جھوم اٹھی اور اسے بھی بانہوں سے تھام کے زور سے گھما ڈالا۔

”شٹ اپ نگ۔“ انوش نے شدید غصے بھرے انداز میں اسے ڈپٹے ہوئے اپنی بانہیں جھٹکے سے چھڑالیں اور پھر وہ اسی غصے جھنجھلاہٹ ناگواری بھرے انداز میں اسے تمام حقیقت بتاتی چلی گئی غصے میں وہ یوں ہی آؤٹ ہو جایا کرتی تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے جو چھپائے ہوئے بھی لفظ لفظ نگین کو بتلاتی چلی گئی جسے سن کر نگین کے دل میں موجود عارض کی قدر ذرا بھی نہیں گھٹی بلکہ اور بھی بڑھ گئی اور وہ خوشی بھی جو عارض کی آنکھوں میں انوشہ کا عکس جھللاتے دیکھ کر نگین کے دل میں جا گئی وہ بھی بے تحاشہ بڑھتی چلی گئی مگر فی الوقت اس نے انوشہ کو مزید چھیڑنے کا ارادہ ترک کر کے خاموشی میں ہی اپنی عافیت جانی تھی۔

☆☆

ابراہیم خان کا بھی اک عام سے مردکاروایتی قسم کا قصہ تھا۔ ان کے باپ اسرار خان نے اپنی پسند اور خواہش سے ان کی شادی اپنے بے حد قریبی عزیز دوست کی بیٹی سے کی جب کہ ابراہیم حدیقہ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ حدیقہ ملک کے ایک بہت بڑے مل اور کی بیٹی تھی اور ابراہیم کی یونیورسٹی فیلو اور پسند بھی مگر باپ کی قطع تعلق اور عاق کر دینے کی دھمکیوں سے مجبور ہو کے ابراہیم نے ان کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ یوں درخشاں ان کے گھر میں آ گئیں مگر ان کے دل میں جگہ نہ پاسکیں اور شادی کے چار سال بعد ہی ابراہیم کا جھکاؤ پھر سے حدیقہ کی سمت ہو گیا

جو اس عرصے میں بیاہ کر بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان کی شادی کے چھ ماہ بعد ایک ایئر کریش میں جال جھٹکتے تھے۔ ابراہیم کے دل میں حدیقہ کو اپنانے کی خواہش سے بیدار ہو گئی۔ انہوں نے حدیقہ سے شادی کر لیا باپ کی عاق کر دینے کی دھمکی ہنوز قائم تھی اس وقت بے سود ثابت ہوئی جب ابراہیم نے حدیقہ شادی کرنے کی اجازت نہ ملنے کی صورت میں درخشاں دونوں کو چھوڑ دینے کا اعلان کرنا چاہا تب کی محبت سے مجبور ہو کر درخشاں فیصلہ اپنے ہاتھ میں پر مجبور ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے دل میں پلٹی محبت سے بہت مجبور ہو کر ان کی خوشی اور خواہش کی ان کو حدیقہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی مگر وعدے پر کہ ابراہیم بھی طلاق نہیں دیں گے اور حدیقہ ابراہیم کی زندگی میں آ گئیں بلکہ ابراہیم کی زندگی میں آ گئے کیونکہ اسرار خان ان کو حدیقہ سے شادی نہ روک سکے مگر ابراہیم کو عاق کر دینے کے بعد گھر سے نکال دینے سے ان کو دنیا کی کوئی طاقت نہ روک سکی تھی۔ حدیقہ کی ماں پہلے ہی حیات نہ تھیں اور اس چار سال کے عرصے میں ان کے والد کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اب کروڑوں کی پراپرٹی کی تنہا وارث حدیقہ خود تمام تر برائیاں کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ ابراہیم کی سنگت میں ان کا کافی بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

درخشاں کے میکے سے بڑھتے دباؤ کی وجہ سے درخشاں کو نہ چاہتے ہوئے بھی سسرال کو چھوڑ کر میکے آ جانا پڑا۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن اور والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کا دکھ سب کے دل میں جیسے زخم ڈال رہتا تھا۔ لاڈلی چپیتی کم عمر بیٹی کے غم اور اس کی ویران اجاڑ زندگی کے صدمے سے منزہ بیگم (درخشاں کی ماں) جلد ہی زندگی ہار گئیں۔ باپ اور بھائیوں کی خواہش تھی کہ ان کو ابراہیم سے خلع لے کر نئے سرے سے اپنے سے کی خوشیاں تلاشی چاہئیں مگر درخشاں نے خلع لینے سے صاف انکار کر ڈالا تھا۔ تو پھر دوسری شادی کا تو سوال ہی

Medipaste  
DENTAL CREAM  
TRIPLE ACTION FORMULA

دانتوں میں درد، مسوڑوں سے خون اور حساسیت سے فوری نجات دلائے چند منٹوں میں اثر دکھائے



بیدار نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے لیے ابرار کی یادیں اور چار سالہ بچی انوشہ کا وجود ہی زندگی کا حاصل تھا۔

موبائل کی پیپ ہونے پر موبائل اٹھاتے ہوئے انوشہ کو اپنی ایک کسمر فریج ہاشمی کا خیال آیا تھا جو صبح اس کے بوتیک میں آنے کا کہہ کر کسی وجہ سے نہ آ سکی تھی۔ فریج سے اس کی چند ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر دونوں میں جلد ہی بے تکلفی اور دوستی استوار ہوتی چلی گئی تھی۔ انوشہ نے اس سے ایسٹ اور ویسٹ کے امتزاج کے کچھ کلرز کے دلفریب و پرکشش ملاپ کا حسین اور یونیک سا تاثر پیش کرتے جدید اسٹائل کے کاڈر ڈریسر بنانے سے متعلق بات کی تھی۔ فریج نے ڈریس ڈیزائنرز ہونے کے ناتے اس کے اس آئیڈے کو سراہتے ہوئے اس کی ممکنہ حد تک ہیپ کا وعدہ بھی کیا تھا۔ فریج کا ڈرائیور آکر صبح بوتیک سے فریج کا مطلوبہ ڈریس لے گیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ میڈم شام میں آپ سے فون پر بات کریں گی کیونکہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے وہ آج یہاں خود نہ آئیں گی۔

”ہیلو۔“ اس کے ذہن میں ابھی تک فریج کا ہی خیال تھا۔

وہ لوگ جو کج ادا لوگ ہوتے ہیں  
وہ لوگ جسم و جاں کا روگ ہوتے ہیں  
کبھی دھڑکن سے سانسوں سا بھوک ہوتے ہیں  
کبھی عمر بھر کا سلگتا سوگ ہوتے ہیں۔

دوسری طرف سے ابھرنے والے بوجھل و قدرے متعطل سا بھاری لب و لہجے کا مدھم گمبیر سا دلفریب ردھم انوشہ کی سماعتوں کو پھلاتا پیل بھر کے لیے تھم جانے والی دھڑکنوں میں غصہ کی باخچاں مچا گیا۔ وہ کھلی کھڑکی کے پاس دم سادھے کھڑکی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

”سنو اے سنگدل لڑکی..... اس من کو..... اس من میں جنم لینے والی اک حسین چاہت کو میں اپنی حیات کے پیل پیل کومہ کا سنوار دینے والا اک خوب صورت دلفریب بھوک بنانا چاہتا ہوں۔ کہیں تم اس تمنا کو عمر بھر کا سوگ نہ

بنادینا۔“ دیکھیے..... میں..... میں یہ سب سننے کی خاطر ہرگز نہیں۔“

”عادی تو میں بھی ہرگز نہ تھا کسی کو سونے کا کپڑا چاہتے رہنے کی خواہشوں کے جنگلوں میں پھنکتے رہنے کا۔“ انوشہ کے تیز رو کھنے ناگوار لہجے کے جواب میں اس کے مدھم تھمے تھمے لہجے میں ہلکا سا شکوہ جھلکا۔

”کیا چاہتے ہیں آپ آخر؟ میرا سکون سے بچو اجیرن کر ڈالا ہے آپ نے۔“ وہ یگانہ جھنجھلا اٹھی۔

”میں چاہتا ہوں تم سے بات کرنا تم سے ملنے اور پھر مل ہی جانا عمر بھر کے لیے۔“ گمبیر لہجہ شوخ ہونے لگا۔

”تو پھر ہم کب مل رہے ہیں۔“ بے حد دوستانہ خوشگوار انداز تھا۔

”کبھی نہیں۔“ وہ جل ہی تو اٹھی اس کے اس انداز پر۔

”اب میں اتنا بھی برا نہیں۔“ ہنوز مسکراتا لہجہ تھا۔

”ہاں اتنے بھی نہیں بلکہ آپ بے حد برے ہیں۔“ وہ بنا کسی لحاظ و مروت کے کہہ گئی۔ یہ شخص مسلسل اس کے ضبط سے کھیلتا چلا آ رہا تھا مگر اب وہ مزید کوئی رعایت برتنا نہ چاہتی تھی۔

”پھر آئی تھنک..... مجھے ہی تمہارے پاس آ جانا چاہیے۔“

”نو..... نیور..... میں کسی طور بھی آپ کا سامنا تک کرنا نہیں چاہتی۔“ انوشہ نے اس کے فیصلہ کن مطمئن انداز پر یکدم تیز تنکھے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے پیڈرو کے کھلے دروازے کو گھبرائی نظروں سے دیکھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے تمہیں خود میرے سامنے آنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں میری وجہ سے تم کل سے کمرے میں خود کو قید کیے ہوئے ہو۔ بری بات..... اس طرح تو بچھپتے ہیں۔“

”کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“ اس نے



ہرگز نہ تھا کسی کو سوچنا  
 فوں کے جنگلوں میں  
 گھنے ناگوار لہجے کے جواب  
 بس ہلکا سا شکوہ جھلکا۔  
 پ آخر؟ میرا سکون  
 وہ یگانگت جھنجھلائی  
 سے بات کرنا، تم سے  
 لیے۔ "کبھی لہجہ شوق  
 ہے ہیں۔" "سب حد  
 تا تو اٹھی اس کے اس  
 "ہنوز مسکراتا لہجہ تھا  
 پ بے حد بے  
 یہ شخص مسلسل اس  
 وہ مزید کوئی رعایت  
 ی تمہارے پاس  
 بھی آپ کا سامن  
 کے فیصلہ کن  
 تے ہوئے اپنے  
 سے دیکھا۔  
 سے سامنے آنا  
 گل سے کمر  
 اس طرف  
 "؟"

بہت مضبوط سے پوچھا۔

"تم ملو تو پھر بتاؤں گا۔" وہی دوستانہ انداز تھا۔  
 "اور اگر میں نہ جانا چاہوں نہ ملنا چاہوں تو؟"  
 "تو سوچ لو ایک برا آدمی کیا کر سکتا ہے پھر۔"  
 "آپ دھمکی دے رہے ہیں مجھے؟ میں ان گیدڑ  
 بھیڑیوں سے ڈرنے والی خائف ہو جانے والی کوئی احمق  
 لڑکی نہیں ہوں سمجھے آپ۔" وہ جیسے تمام تر ضبط کھو کے  
 ناگواری کے شدید احساس سے چبھ اٹھی۔  
 "کیا یہی بات تم اس کھڑکی سے بائیں سمت لان کی  
 طرف دیکھتے ہوئے پھر سے کہہ سکتی ہو۔" اس غیر متوقع  
 عجیب و غریب فرمائش پر انوشہ کی نگاہیں غیر ارادی طور پر  
 اٹھتی چلی گئیں اور اگلے ہی پل اس کی دھڑکنوں کے ساتھ  
 اس کی سانس بھی تھمنے لگیں لان میں چیمبرز پر ذیشان  
 سامع چچا شعور چچا اور دادا جان اپنی اپنی چیمز پر براجمان  
 باتوں میں مصروف تھے اور ان سے چند ہی گز کے فاصلے  
 پر لان کی سبز گھاس پر وہ ننگے پاؤں ادھر ادھر ٹھہلتا موبائل  
 کان سے لگائے ادھر کھڑکی کی سمت ہی جانے کب سے  
 تگے جا رہا تھا۔ انوشہ کے متوجہ ہوتے ہی اس نے عقب  
 میں کمریہ دھرا بایاں ہاتھ اٹھا کے سب کی نظر بچا کر اک  
 گہری مسکراہٹ سمیت اس کی سمت ہاتھ ہلا کے دوستانہ  
 انداز میں وٹ کیا تھا۔ انوشہ کا چہرہ یگانگت اک انجانی تپش  
 سے سلگ اٹھا۔ وہ کتنے ہی پل بھینچ جانے والے ہونٹوں  
 سمیت سن سی کھڑی اس کی سمت تکتی رہی تھی بلیک پینٹ  
 پر براؤن شرٹ میں وہ نکھر نکھر اساکھڑا تھا۔  
 "تم مجھ سے ملنے کا میری بات سننے کا وعدہ نہیں کرو  
 گی تو میں وہ بات ابھی یہیں پر چیخ چیخ کے سب کے  
 سامنے بتا دوں گا اور اسے خالی خولی دھمکی مت سمجھنا بلکہ  
 ایک قول سمجھنا ایک مرد کا قول۔" اس کی بات پر انوشہ گھبرا  
 گئی۔  
 "میں..... میں آپ کی بات ماننے کو تیار ہوں مگر باہر  
 کہیں نہیں۔ یہیں گھر میں۔" اس کی بے باکی کا ایک  
 خطرناک مظاہرہ وہ پہلے ہی ٹلین کے سامنے دیکھ اور جھلک

چکی تھی۔ وہ کیا بات کہنا چاہتا ہے اور اسے اپنے سامنے  
 کے رو برو ملاقات کے لیے مجبور کیوں کر رہا تھا۔ وہ کیا  
 چاہتا تھا۔ یہ اس کا لہجہ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں مگر  
 انوشہ ایک بار پھر کسی خوش فہمی کی شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔  
 "انوشہ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہی مجھے۔"  
 اور پھر رات کو ٹلین، جبین، راحیلہ عدیلہ کے درمیان اسے  
 ٹی وی لاؤنج میں موجود پاکر اس کے چہرے پر ایک مدھم  
 مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ انوشہ کی گود میں رکھے کٹن پر  
 دھری چلغوزوں سے بھری پلیٹ میں سے جھک کر  
 چلغوزے مٹھی میں بھر کے وہ قدرے فاصلے پر بڑے  
 سنگل صوفے پر بیٹھتا اچانک بولا تھا۔ انوشہ نے گڑ بڑا  
 کے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سیاہ دراز پلکوں تلے  
 لابی حسین آنکھوں میں در آنے والی بے بسی کو تکتے  
 ہوئے عارض کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔  
 اس نے چلغوزہ چھیل کر لبوں میں دبا کے پھر منہ میں منتقل  
 کرنے کے بعد اطمینان سے کھاتے ہوئے سسپنس کو  
 چند لمحے کے لیے برقرار رکھا تھا۔  
 "یہ..... اس نے دوسرا چلغوزہ چھیل کر منہ میں  
 ڈالتے ہوئے انوشہ کو یونہی گہری مسکراہٹ سمیت تکا  
 تھا۔ "کافی بہت اچھی بنائی ہے۔" مسکراتی نگاہیں انوشہ  
 کی سٹیٹائی سی آنکھوں کی پریشان بے بس روشنیوں میں  
 الجھائے الجھائے اس نے بات مکمل کی تو انوشہ کے  
 چہرے پر اطمینان بکھر گیا جب کہ ٹلین کو انوشہ کی گھبراہٹ  
 اور عارض کی معصوم سی شرارت پر بڑے زور کی ہنسی آئی تھی  
 جس پر انوشہ نے اس کو کچا چبا جانے والی نظروں سے  
 دیکھا اور عارض یونہی اطمینان سے بیٹھا چلغوزے چھیل  
 چھیل کر منہ میں ڈالتا مزے سے مسکراتا انوشہ کو تکتا رہا۔  
 "عارض بھیا! آپ کی ممی نے آپ کو یہاں آپ کی  
 شادی کرنے کے لیے بلایا ہے نا؟" چودہ سالہ راحیلہ  
 نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔  
 "تمہیں میری بات کا یقین نہیں میں نے ذیشان  
 بھیا کو ماما سے بات کرتے ہوئے خود سنا تھا۔" راحیلہ سے



دو برس بڑی عدیلہ کو اس کی عارض سے تصدیق ڈرانہ بھائی تھی۔

”سنا تو میں نے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔“ وہ اپنے دونوں شغل بدستور جاری رکھے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”تو پھر آپ کس سے شادی کریں گے؟“ راحیلہ کے سوال میں معصوم ساشتیاق تھا۔

”بھئی ظاہر ہے کہ ایک لڑکی سے شادی کروں گا۔“

عارض کی نظریں بدستور انوشہ کی جھکی پلکوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ بظاہر بے نیازی سر جھکا کے بیٹھی شہادت کی انگلی کی مومی پور سے اپنے سامنے رکھی پلیٹ میں بھرے چلغوزوں کو ادھر ادھر منتشر کرتی اندر ہی اندر اس کی نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پہ محسوس کرتی سلگی جارہی تھی۔ اسی پل قدموں کی آہٹ اور بولنے کی آوازوں پر جبین کچھ کہنے کا ارادہ کرتی پھر اندر آنے والوں کو دیکھتی خاموش رہ گئی۔

ذیشان دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس اٹھائے بے حد خوش خوش پر مسرت چہرے سمیت تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ادھر بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے شعور چچا (ذیشان کے والد) تھے اور ان کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اندر داخل ہوتے شخص کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ان سب میں کھلبلی سی مچ گئی حیرت بے یقینی و مسرت کے ملے جلے احساسات سمیت وہ سب خواب کی سی کیفیت میں گھرے گھرے گنگ سے رہ گئے تھے۔

اپنی گود میں پڑی پلیٹ سے لکھت بے نیاز ہوتی جھٹکے سے کھڑی ہونی انوشہ بالکل غیر ارادی طور پر غیر محسوس انداز میں عارض کے اونچے کشادہ سراپے کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔

”ارے بھئی یہ اس طرح کھڑے کیا دیکھ رہے ہو بیٹا تم لوگ آگے بڑھ کر ویکم بولو بیٹا اپنے پھوپھا جان کو۔“

شعور چچا کی پیار بھری ڈانٹ پر اپنی سمت جھل جھل ہوئے ہوئے مسکرائی جبین نکمین راحیلہ عدیلہ کو قدم بڑھاتے دیکھتے ابرار کی تھکی تھکی ناکام نگاہیں بے تابانہ انداز میں ان

تک پہنچیں۔

”یہ سب پیاری پیاری بچیاں ماشاء اللہ تمہارا ہجرتیں عارض پکڑو بیٹا اس کو۔“ تعارف کراتے شعور لکھت غیر متوقع ہدایت پر عارض نے ان کے اشارے پر یکدم اپنے عقب میں کھڑی انوشہ کو مڑ کے تیزی سے قدم بڑھاتے دیکھ کر اسے بے اختیار بازو سے پکڑ کر روک لیا اور پھر انوشہ کی کمزوری مزاحمت کو یکسر نظر انداز کرتے عارض نے اسے عقب سے شانوں سے تھام کر ابرار کے قریب لے جا کھڑا کیا تھا۔ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپاتی ان کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھی اور پھر اس کے محلے گریزاں بدگمانی کی لہروں میں لیے دوہرے کے گرد لکھت ایک مہربان آغوش کا شفیق حصار قائم کیا۔

”انوشہ..... انوشہ میری بیٹی میری جان میری بیٹی۔“ اسے شفیق سننے سے لگائے شفقت بھری بے تابی سے آغوش میں بھینچ کر اس کے سر ہاتھوں پیشانی کو چومنے ابرار تمام تر ضبط کھو کے بے اختیار رو پڑے تھے۔

”مجھے معاف کر دو بیٹے معاف کر دو اپنے اس بدنصیب گناہ گار باپ کو معاف کر دو میری بیٹی..... میری بیٹی..... معاف کر دو..... بھٹک گیا تھا میں..... دولت کی ہوس نے تمہارے اس مجرم باپ کی آنکھوں پر لالچ..... بے رحمی اور خود غرضی کی پٹی باندھ دی تھی۔ بیٹے بہت تڑپا ہوں میں..... بہت رویا ہوں بہت چوٹ کھائی ہے میں نے روح تک زخم زخم ہو چکا ہوں اب اور تاب نہیں ہے مجھ میں مزید ہمت اور برداشت نہیں ہے مجھ میں۔ اپنے اصل سے فرار حاصل کرتے کرتے اپنی ذات تک کو فنا کر چکا ہوں راکھ کا ڈھیر ہو گیا ہوں بیٹے یہ چند سانسیں باقی ہیں یہ بھی خاکستر ہونے کو ہیں راکھ بن کر بکھرنے کے بعد بالآخر یہ بھی بے نام و نشان ہو جائیں گی۔ میری ذات کے تکبر میرے زعم کی مانند یہ بھی فنا ہو جائیں گی اگر..... اگر تم نے مجھے معاف



بتائے پر نگین نے جل کر کہا تھا اور اب بھی موقع ملتے ہی وہ انوشہ کی کھچپائی کرنے آن پہنچی تھی۔

”یہ سب بابا جان کی خواہش ہے اور اتنا حق تو ان کا میری ذات پر بہر حال ہے ناں۔“ کتنا بہت سا کرب جل اٹھا تھا اس کی جھکی جھکی پلکوں تلے خوشنما آنکھوں کے اداس چراغوں میں کتنی اذیتیں سرخ رہی تھیں۔ قلب و روح کے گرد کھڑی گردی جانے والی اونچی پتھریلی دیواروں سے کیسا کہرام مچ گیا تھا اس کے اندر۔

”وہی بابا جان ناں جو ان دو روز سے قبل تمہارے لیے ایک نہایت خود غرض بے رحم بے حس اور نا معلوم کیا کیا تھے اور جن کا تم عمر بھر چہرہ تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔“ نگین کو اس کی اس قدر بے نیازی غصہ دلا گئی۔

”نہیں میرے بابا جان ایسے نہیں وہ تو ایسے ہیں کہ ان پر میں اپنا سب کچھ نثار کر کے بھی عمر بھر چین کی نیند سوئی رہوں۔“ کتنی محبت تھی اس کے محرومیوں کی گرد میں اٹے لہجے میں تھکی تھکی حسرت بھری نگاہوں میں اور باپ کی محبت و شفقت کے انمول احساس کی چمک سے متممٹا اٹھنے والے چہرے پر جب کہ اس کا یہ اطمینان نگین کے غصے کو مزید بڑھا گیا۔

”مت دھوکا دو۔ مت دھوکا دو خود کو انوشہ ابرار بہت کچھ بتاؤ گی تم اور خدا نہ کرے کہ وہ کچھ بتاؤا عمر بھر کا کوئی روگ بن جائے۔“ نگین کے بغور اپنی سمت تلتے ہوئے کھر درے لہجے میں کہنے پر انوشہ یگھخت بے چینی سے رخ پھیر گئی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد نگین قدرے نرم لہجے میں بولی۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اس سے اپنے من کی طرف سے نگاہ پھیر لیں جب کہ ہمارے من کو ہماری توجہ کی ہمارے سہارے ہمارے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے نہ صرف ہماری توجہ اور ساتھ کی بلکہ کسی کی چاہتوں میں آباد رہنے کی کسی کی محبت کسی کی سنگت کی بھی۔“

”فارگاڈ سیک گئی میں اس ٹاپک پر مزید ایک لمحہ بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہوں گی نہ آج نہ پھر بھی۔“ وہ وہاں

بیٹھا خدا کے لیے خدا کے لیے اپنے سامنے اس زندہ لاش میں اپنی معافی اپنی فراخ دلی اپنی زندگی کی رفق بھر دو معاف کر دو بیٹا“ ابرار خان اسے ساتھ لپٹائے ہوئے لے اٹھا کرتے شدت ندامت و پشیمانی سے سکتے کے ضبط کو بکھیرتے بے اختیار اسے بھی ہلک اٹھنے تمام بدگمانی اور شکوے گلے فقط اک پل اس کی ذہنی ڈمگانی ذات کے بھنور سے محو ہوتے وہ خود یہ ضبط کے پہرے بٹھاتے بٹھاتے بھی اختیار ہلک ہلک کے رو پڑی تھی اور موم کے پکھلنے اس غیر متوقع منظر کو حیرت آمیز دلچسپی سے تکتے انوشہ کے گداز ہونٹوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی آگے بڑھ کے ان کنول سے نینوں سے چھلکتے

نسوؤں کو اپنی پوروں میں سمیٹ لینے کی بے اختیاری انوشہ کے من کے کسی گوشے میں شدت سے انگڑائی لے کر بیدار ہوتے محسوس ہونے پر وہ فقط گہری ہوتی مسکراہٹ سمیت سر کو ہولے سے نفی میں ہلاتا بے اختیار اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کے دھیرے سے لب اک بیٹے کو معاف کر دو۔

☆☆

”کمال ہے اس میں اس قدر پریشانی کی کیا بات تمہارے اس مجرم باپ۔ ہر لڑکی کا ایک نہ ایک دن.....“ انوشہ نے لب اور خود غرضی کی پی بات کھولے تو نگین اس کی بات کاٹ گئی۔

”اور عارض بھیا..... ان کے بارے میں سوچا ہے کچھ تم نے..... کتنے اب سیٹ ہو کر رہ گئے ہیں وہ بے اختیار نے جب سے ابرار انگل نے یہ نیا شوشہ چھوڑا ہے۔“ نگین کا موڈ سخت خراب تھا۔ جب سے ابرار انگل نے اپنی مرحومہ بیوی حدیقہ کے کسی سبط نامی کزن کا بڑا شاندار سا پروپوزل تمام بزرگوں کے سامنے بڑی عاجزی و انکساری کے ساتھ پیش کیا تھا۔

”اپنے عارض بھیا کسی سے کم شاندار ہیں۔“ جبین کے اس شاندار سے پروپوزل کے بارے میں



سے تیزی سے جانے کو بڑھی۔  
 ”میں نے دیکھی ہیں۔“ نکین نے اسی تیزی سے  
 بڑھ کر اس کی راہ روکی۔ ”میں نے دیکھی ہیں ان کی  
 آنکھیں اس سے کہ جب ان میں تمہارا عکس بولتا ہے وہ  
 عالم جب وہ شخص تمہاری چاہتوں کے گرداب میں سرتاپا  
 جکڑا دکھائی دیتا ہے۔ خود فراموشی کی وہ کیفیت کہ جب تم  
 اس کے سامنے ہو اور وہ چار اطراف سے ہر شے سے ہر  
 بات سے حتیٰ کہ اپنے آپ تک سے بیگانہ ہو جاتا ہے  
 انوش۔“ نکین نے ہولے ہولے کہتے ہوئے اس کے رخ  
 پڑ جانے والے ہاتھوں کو محبت سے تھام کر کچھ مزید کہنے کو  
 لب واکے تھے مگر انوشہ بے ساختہ ہونٹ پیچتی اس کے  
 ہاتھوں سے ہاتھ چھڑاتی یکایک اس سے دور ہوتی  
 نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ نکین بے بسی سے مٹھیاں  
 بھینچتی اس خود سراجق لڑکی کو دل ہی دل میں برا بھلا کہنے  
 کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔

”تم..... گھمنڈی..... بے وقوف لڑکی..... آخر سمجھتی  
 کیا ہو تم خود کو۔“ وہ نکین سے جان چھڑاتی نہ چاہنے کے  
 باوجود اپنے بیڈروم سے نکلنے کے بعد امی کے بیڈروم میں  
 پناہ لینے چلی آئی تھی اور دو روز سے موقع کی تلاش میں  
 بے چین و مضطرب عارض کے جیسے روم روم میں برق بھر  
 گئی تھی اور پھر اسے اچانک اپنے روبرو پا کے بے طرح  
 گڑبڑا جانے والی انوشہ کے اوسان جیسے لمحے بھر میں خطا  
 ہوئے تھے۔ اس پر مزید عارض کے لیکھت ضبط کھو کے  
 بے طرح چیخ کے گھٹے گھٹے انداز میں پھٹ پڑنے پر  
 انوشہ کا وجود اور گوں میں گردش کرتا لہو تک رخ سا پڑ گیا۔  
 ”کسی کے جذبات کا مذاق اڑانے کا کسی کی ذات  
 کی بے بسی کا تماشا بنانے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔“ بے حد  
 خفگی بھرا تیکھا سلگتا لہجہ تھا۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو والے  
 مضطرب بجھے بجھے چہرے پر بے تحاشہ لودیتی الجھی  
 جھنجھالی نگاہوں سے نگاہ چرائی وہ بے ساختہ رخ پھیر  
 کے تیزی سے کمرے سے نکلنے لگی مگر عارض نے اس کی  
 راہ میں حائل ہوتے ہوئے اس کے ارادے کو ناکام

”بہت چاہا، بہت چاہا میں نے کہ تمہاری اس  
 دھرم انا کے زعم کو تمہارے اس اعتماد کے بھرم کو نہ توڑوں  
 مگر خود تم نے مجھے اس پر مجبور کیا ہے۔“ اس کا جارحانہ  
 تیا انداز بگڑے اکھڑے تیور بھاری لب و لہجہ میں چھلکا  
 کر خشکی اور درشتگی پہ انوشہ کی دھڑکنیں اور حواس پر  
 تیزی سے منتشر ہوئے تھے مگر وہ خود کو کسی طور بھی اس  
 سامنے کمزور ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔

”کیوں چھپنا چاہتی ہو کیوں بھاگنا چاہتی ہو  
 سے۔“ اس کے ایک بار پھر تیزی سے پلٹ کر دروازے  
 کی سمت پیش قدمی کرنے پر عارض نے یکدم بھڑک  
 ایک بار پھر اس کا راستہ روک لیا۔

”محبت کرنا جب کوئی جرم نہیں تو محبت ہونا تو  
 ایک بالکل غیر ارادی یکسر بے اختیاری جذبہ ہے۔  
 کچلو اس انمول احساس کی کونپلوں کو مت روندو اس  
 جذبے کی ان چھوٹی پاکیزہ شدتوں کو ایسا نہ ہو کہ یہ  
 جارحانہ اقدام تم سے تمہاری ذات کی پہچان چھین لے  
 کہیں تم اپنے آپ کو ہی نہ کھودو۔“

”پلیز..... پیچھا..... پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے  
 آپ میرا آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“ وہ اس کے بے حد  
 پتھر لیے لہجے سپاٹ انداز میں کھری کھری سنانے پر  
 یکدم ہی ضبط گنوا کے بے طرح چیخ کے رہ گئی۔

”میں کیا چاہتا ہوں کیا تم نہیں جانتیں میں وہ چاہتا  
 ہوں جو تم چاہتی ہو مگر جس کا اعتراف تمہارے لیے  
 تمہاری انا کی شان کے خلاف ہے ایسا ہی ہے ناں پولیڈیا  
 پھر شاید تم میری اک ذرا سی بھول کی سزا اپنی اس بے رحمی  
 بے نیازی کے زہر میں مجھے نشروں کی صورت مجھے دیے  
 چاہتی ہو جو میری روح کو پیل پیل تا عمر چھید چھید کر زخمی  
 کرتی رہے میں تو تمہیں بہت سمجھدار اور اک مہربان لڑکی  
 سمجھا تھا مگر افسوس کہ اس مہربان لڑکی نے مجھے میرے  
 دل کو بہت بری طرح سے گھائل کر ڈالا ہے۔ کہیں کاش  
 تو نہ چھوڑا مجھے مگر سنو مجھے اپنے جیون کے کسی بھی







اس کی پیشانی بے ساختہ چوم لی۔ انوشہ کے پگھڑیوں سے ہونٹوں پر مدھم سی مسکان لرز گئی اور اگلے ہی پل نہ معلوم کس احساس نے اس کی پلکوں کو بھگو ڈالا تھا کسی کے اپنی سمت لپکنے کے بعد فوراً ہی پیچھے ہٹ جانے کے بعد اک نامانوس سی اذیت قلب و روح پر چھاتے ہی کسی کے دور چلے جانے کے سوہان روح سے احساس سے شل ہو جانے والی دھڑکنوں میں کسی کے لوٹ آنے کی آس جو پل رہی تھی۔ وہ جیسے آج جواں ہوتی اس کے من میں ان گنت امتگیں بھرنے لگی تھی مگر وہ جوا اپنے جھکائے جانے کا کرب آمیز احساس تھا وہ آنکھوں میں تیرتا سانسوں میں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

اور پھر یکا یک ہی جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھمادی تھی عارض کے پروپوزل کو سب سے پہلے خود ابرار نے ہی سراہا تھا بات منگنی سے چلتے چلتے نکاح تک جا پہنچی جو ستارہ کے بے حد قائل کرنے کے بعد دادا جان کا حکم بن گئی عید کے فوراً بعد ان دونوں کے نکاح کی تاریخ رکھی گئی سب ہنستے مسکراتے چہروں سمیت ستارہ کی عجلت پر حیران اور عارض کے اصرار پر اس سے بھی زیادہ حیران تھے۔

اور پھر وہ عید کی صبح تھی بے حد اجلی اجلی روشن بے تحاشہ حسین مہکتی ہوئی پر بہاری ابرار خان کی بے حد منت سماجت معافی گزارش کے بعد اسرار خان کا دل بہو (درخشاں) کی سفارش پہ بیٹے کے لیے نرم ہو چکا تھا۔ باقی دونوں بیٹیوں اور دونوں بیٹیوں کی فیملیز کے ہمراہ آئے ڈرائنگ روم میں اب ان سب کے درمیان بڑے عرصے بعد پرسکون سے بیٹھے تھے۔ برسوں کی رنجشوں کی گرد صاف ہو جانے کے بعد کا منظر بے حد طمانیت خیز اجلا اجلا اور نکھر نکھر اُٹھا تھا۔

☆☆

رات کو سب کھانے کے بعد لان میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ عارض چپکے سے اس کی تلاش میں نکلیں کی بتائی گئی جگہ پر چلا آیا تھا وہ دونوں میز پر چہل

قدی کے لیے آئی تھیں۔ جب نکلیں کسی بہانے اس پاس سے ہٹتی اسے پانچ منٹ میں واپس آنے کا حکم عارض کے پاس پہنچی تھی اور اگلے چند لمحوں میں وہ کے قریب تھا۔ بھاری لہجے کے شوخ ترنم اور نکلیں کے دلفریب مسخور کن مہک کے سحر انگیز احساس اور لباس سرسراہٹ کو قریب آتے محسوس کر کے انوشہ نے قدم چوٹ کر پلٹ کے اس سمت نگاہ کی اور اگلے ہی پلکوں کی پلکیں لرز کے دھک اٹھنے والے عارضوں پہ سایہ ہوتی چلی گئیں۔ بے اختیار ہی اس کے قدم مخالف سمت اٹھے مگر دو مضبوط کشادہ ہتھیلیوں کا دباؤ کا نازک شانوں پر پڑتے ہی اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ کے رہ گئے۔

”عید کے موقع پر تو..... عید ملا کرتے ہیں کسی پاس آنے پر یوں فاصلوں کی دوریوں کی لکیر نہیں کھینچتے۔“ مدھم مدھم دھڑلے کی بوجھلتا میں بالینے خمار تھا جب کہ انوشہ نے اس کے بامعنی لہجے کی مسکراتی گہری شوخی پہ بہت سٹپا کے پلکیں اٹھاتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹنا چاہا تھا مگر عارض نے ہولے سے اس کی چٹائی مرمریں کلائیوں کو تھام کے ایک بار پھر اس کے اٹھنے قدموں کو روک دیا۔ لابی مضبوط انگلیوں کی نرم استحصال گرفت پہ کالج کی انگوری کلر کی خوب صورت نازک چوڑیاں سمٹ کے بکھرتی کھنکی تھیں۔

”پلیز۔“ اس نے ہلکی سی مزاحمت سے کلائیوں چھڑانی چاہیں عارض نے اس کے حنائی گداز ہاتھوں کو بھینچتے ہوئے کچھ اور فاصلہ سمیٹا۔

”پلیز تو مجھے کہنا چاہیے ڈھیر ساری ندامتوں پشیمانی اور معذرتوں سمیت اتنا پریشان جو کیا تم کو اتنا ستایا جو تم پلیز اس سب کے لیے معذرت پہلے جو بھی میں نے کیا مجبوری کے عالم غیر ارادی طور پر کیا پھر تم میرے دل کی دنیا کو بدل کر میرے پل پل کو محبت بن کر چاہت بن کر نکھا سنوار گئیں اور پھر ایک بار پھر نہایت بے بسی کے عالم میں بہت سخت اور سخت الفاظ میں میں نے جو بھی تم سے کہا وہ بھی تمہاری برہمتی ہوئی بے رخی اذیت ناک ہے



بے چارہ کب سے..... اونچی ناک تلے مضبوط لبوں کی مسکراہٹ بڑی شوخ تھی۔

”عارض پلیرز“ وہ اس کے شرارت سے مسکرا کے کہتے ہوئے پاس آنے پر ہڑبڑا کے پیچھے ہٹی۔

”اچھا تو چلو پھر عیدی.....“ وہ یوں ہی پاس آ کے مسکراتا اس کی سمت جھکا تو بے تحاشہ حواس باختہ ہوتی انوشہ نے حیا آلود چہرہ حنائی ہتھیلیوں میں چھپاتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ عارض نے بڑھ کے ہولے سے ہاتھ ہٹا کر اس کا لپٹا یا شرمایا چہرہ کشادہ ہتھیلیوں میں تھام لیا۔ دو شفاف موٹی اس کی لرزیدہ جھکی پلکوں سے ٹوٹ کر عارض کی ہتھیلیوں میں جذب ہو گئے۔

”ہے مقید چاند کے ہالے میں بس شبیہ رخ یار کی ہے میری نگاہ کے آئینے کو بس چاہ تیرے سنگھار کی کھویا من خواہشوں کے دیار میں

انہی چاہتوں کے خمار میں

ہو چاند تیری دید کا ہو عید میرے پیار کی

عارض کے نبھاری گمبھیر محبتوں کی چاشنی میں لبریز دلکش لہجے پر انوشہ کے نازک گلاب کی پتیوں سے ہونٹوں پر بے اختیار شرمگیس مسکان چٹخ کے نکھرتی چلی گئی۔

”باندھ لیا ہے تم نے تو مجھ کو جہاں بھی جاؤں گا۔ پلٹ کے آنا بڑے گا جسے مہربان سمجھا وہی دلبر ستم گر ٹھہرا۔“ اس کی بھیگی پلکوں میں چمکتی نمی کو پوروں میں جذب کرتے عارض کا لہجہ بے خود سا ہوتا ہوا تھا۔ انوشہ بھیگی پلکیں عارضوں پر جھکاتی ہوئے ہوئے مسکراتی رہی کہ اب تو اسی کی باتوں سے اسی کی قربت سے ہر پل کو مہکتا تھا انگ انگ کو سنورنا تھا اور ہر عید کو نکھرتا تھا۔



نیازی کو اپنے اور تہارے بیچ فاصلوں کی خلیج بن جانے کے اندیشوں سے بہت خائف ہو کر ضبط و حواس کھو دینے کے بے اختیاری عالم میں اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا اگر تم نے پھر وہ بے رخی وہ بے نیازی برتنا چاہی۔“ وہ لحظہ بھر کو ٹھہر کے انگوری کلر کے بے حد دلکش نفیس نازک کام والے سوٹ پہ ہم رنگ دوپٹے میں سمٹے سے گداز دودھیا گلابی حسین سراپے اور ہولے ہولے گہری ہوتی حجاب کی گلابیوں میں نہاتے دلکش نازک نقوش والے چہرے کو الفت بھری نگاہوں سے تکتا ہولے سے مسکرا دیا۔

”ٹھیک ایک ہفتے بعد میری پاکستان سے روانگی ہے اور ان سات روز میں جب بھی ملنا چاہوں تمہیں دیکھنا چاہوں یا فون کروں تو بھی ان ہونٹوں پر ازکار چٹختا نہ دیکھوں۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“ وہ سپاٹ لہجے میں کہتی یلخت اس کی نرم پڑ جانے والی گرفت سے ہاتھ چھڑا گئی۔

”بے حد ضروری بھی اس طرح ملنے سے بات کرنے سے ایک دوسرے کو سمجھنا آجائے گا۔ اندر اسٹینڈنگ پیدا ہوگی۔“

”کیا یہ انڈر اسٹینڈنگ شا..... بعد میں نہیں پیدا ہو سکتی؟“ وہ ان گہری گہری نگاہوں میں مچلتی مدہوش کن سی روشنیوں سے نگاہ چرائی یونہی قدرے روڈ سے لہجے میں ہولے سے بولی تو وہ اس کے شادی کے بعد میں کہتے کہتے یلخت فقط بعد میں کہنے پر ہولے سے ہنس پڑا۔

”سو تو ہوگی ہی بلکہ ایک چھوڑ کئی انڈر اسٹینڈنگز پیدا ہوں گی۔“ بے حد شریر مسکراتے لہجے میں کہنے پر انوشہ کے رخساروں پر گرم گرم لہو سمٹ آیا۔

”جی نہیں۔“ وہ بے ساختہ خفگی بھری نگاہوں سے تکتی پھر جھینب کے نگاہ چرا گئی۔ اس کے جی نہیں کہنے پر عارض کا ہنسنے لگا بے ساختہ تھا۔

”ارے..... ارے سنو تو..... عید تو مل لیجیے حضور بندہ